R.NO. 2136/37

نگار

سالانہ چندہ (علاوہ مصارف رجسٹری سالنامہ)

ہندوستان	پاکستان
نو روپے	دس روپے
۵۰ نئے پیسے	

قیمت فی کاپی

ہندوستان	پاکستان
۷۵ نئے پیسے	بارہ آنے

تصانیف نیاز فتح پوری

من ویزداں

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ اخوت عامہ کے ایک نئے رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور مذہب کی تحقیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحافت مقدسہ کی تاریخ پر تاریخی و علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپئے آٹھ آنے (علاوہ محصول)

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے اس کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) برزخ (۱۷) یاجوج و ماجوج (۱۸) ماروت و ہاروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۲۶۲ صفحات کاغذ دبیز۔ قیمت پانچ روپئے آٹھ آنے (علاوہ محصول)

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ، ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت پانچ روپئے آٹھ آنے (علاوہ محصول)

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے ہیں۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت چار روپئے (علاوہ محصول)

مکتوبات نیاز (تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ ان ایڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا اور ۶۸ پونڈ سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپئے (علاوہ محصول)

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشائے لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنھیں حضرت نیاز کی فسانے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپئے (علاوہ محصول)

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان تخئیل اس کی نزاکت بیان اس کی انشائے عالیہ حد حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت دو روپئے (علاوہ محصول)

چراغِ منزل

یہ ماتھے پہ، چہرے پہ ہیں جھُرّیاں یا بُڑھاپے کا پھیلا ہوا جال ہے!
اِنہی جھُرّیوں میں مگر عقل و دانش کے کچھ ایسے نکتے نہاں ہیں،
جو اِس طفلِ کمسن کو محنت، محبت کے دستور سکھلائیں گے،
چراغوں کی مانند جو منزلوں کی اِسے راہ دِکھلائیں گے!
جواں ہو کے اپنے تجربوں سے سیکھے گا، ڈھونڈے گا خود اپنی راہیں،
پھر آئے گا وہ دن جب اِس نوجواں کی تنومند و مضبوط باہیں،
ہزاروں جواں بازوؤں کی رفیق و مددگار بن جائیں گی ...
وہ بازو جو مصروفِ محنت ہیں اِک عالمِ نو کی تعمیر کے واسطے
وہ اِک عالمِ نو ذرا اور بھی دُور ہوگا جو غم سے،
جہاں ہونگی خوشیاں ذرا اور نزدیک ہم سے!

آج بھی، پہلے کی طرح، ہماری مصنوعات آپ کے گھروں کو زیادہ صاف، زیادہ تندرست اور زیادہ مطمئن بنانے میں مددگار ثابت ہو رہی ہیں۔ لیکن آج ہم ...
کل کیلئے کام کر رہے ہیں، جب زیادہ آرام دہ زندگی کیلئے آپکی بڑھتی ہوئی ضروریات، اور زیادہ سہولتوں کی طلبگار ہونگی۔ اور ہم زیادہ وسیع ذرائع، نئی ایجادوں اور نئی مصنوعات سے اُسوقت بھی آپ کی خدمت کیلئے تیار پائے جائینگے!

آج اور ہمیشہ ... ہندوستان لیور کا آدرش — گھر گھر کی خدمت۔
PR. 1 X12UD

۶۰ء کے سالنامہ "نگار" کی بعض خصوصیات

۱- یہ سالنامہ خالص ادبی چیز ہوگا لیکن وہ محض ادب ہی ادب نہ ہوگا بلکہ اس میں وہ سب کچھ ہوگا جو علمی، افادی و تاریخی نقطۂ نظر سے بہترین اسلوب نگارش کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ یعنی اس میں نقدِ شعر بھی ہوگا، اساتذۂ سخن پر بھی گفتگو ہوگی، وسیع جمالیاتی مطالعہ بھی ہوگا، نسائی دُنیا کی نفسیات بھی ہوگی اور علم و اعتقاد کی کشمکش پر بھی ہوگی اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ انشاء عالیہ کا ایسا بے مثل نمونہ ہوگا جس کی کوئی دوسری مثال ادب اُردو میں مل ہی نہیں سکتی اور جس کا ہر ہر لفظ ایک ادبی جواہر پارہ ہوگا۔

یہ سالنامہ ایک ایسی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون کی طرف سے پیش کیا جارہا ہے جنھوں نے حضرت نیازؔ کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے اور جس کا ایک بسیط تعارف بھی مع ان کی تصویر کے اس میں شامل ہوگا، علاوہ اس کے چونکہ یہ سالنامہ ایک حیثیت سے حضرت نیازؔ کی داستانِ حیات بھی ہے اس لئے ان کی تصاویر بھی مختلف زمانوں کی شایع ہوں گی۔

منیجر نگار

نگار کے ایجنٹوں سے خطاب

کاغذ کی گرانی و کمیابی کی وجہ سے سالنامہ "نگار" ۶۰ء اتنی تعداد میں شایع نہ ہوگا کہ بعد میں بھی اس کی فراہمی ہوسکے۔ اس لئے

ایجنٹ صاحبان

سے درخواست ہے کہ وہ جلد از جلد مطلع فرمادیں کہ انھیں زیادہ سے زیادہ کتنی کاپیاں درکار ہوں گی۔ قیمت فی کاپی تین روپیہ اور کمیشن وہی جو ہمیشہ دیا جاتا ہے۔

منیجر نگار

ادارۂ "نگار" کی شاخ پاکستان سے

"انتقادیات" شایع ہوگئی ہے اور "جذبات بحاشیہ"۔ "نقاب اُٹھ جانے کے بعد"۔ "تاریخ کے پوشیدہ اوراق" پریس جاچکی ہیں۔ اس لئے ہماری مطبوعات حاصل کرنے کے لئے وہاں اس پتہ سے خط و کتابت کی جائے:۔

عارف نیازی ــ ادارۂ ادب عالیہ۔ ضوبیہ کالونی - ۵ C/2 متصل ڈاکخانہ گولیمار نمبر ۲ - کراچی

لیکن

نگار کا سالانہ چندہ دس روپے بدستور ذیل کے پتہ سے بھیجا جائے:۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۱۰۵ - گارڈن ویسٹ ــــــــ کراچی

اور رسید ڈاک خانہ لکھنؤ روانہ کردی جائے

منیجر نگار

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ نومبر میں ختم ہوگیا اور دسمبر کا پرچہ نور روپیہ ۵۶ پیسے میں وی پی روانہ ہوگا

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

جلد ۷۶	فہرست مضامین نومبر سنہ ۱۹۵۹ء	شمار ۵

ملاحظات ---------- اڈیٹر ---------- ۳
مطبوعہ طلسم ہوشربا ---- راز یزدانی ---------- ۲
فلاسفہ کا تصور الٰہ ---- نواب محمد عباس طالب صفوی - ۱۳
سرزمین رودکی و سعدی - ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی -- ۱۷
آنسٹین کے نظرئے ---------- ۲۰
آزادی کے بعد اردو شاعری -- پروفیسر ابو محمد سحر فتحپوری - ۲۴
مولانا آزاد ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے .. پروفیسر رفیع الدین عنایتی - ۲۷
باب الاستفسار (قصیدۂ مومن) -- اڈیٹر ---------- ۳۱
باب المراسلہ والمناظرہ (احمدی جماعت) - اڈیٹر ---- ۳۵
عہد عباسیہ کا دور زریں ---------- اڈیٹر ---------- ۴۲
کشکول ---------- اڈیٹر ---------- ۴۶
منظومات :- پروفیسر شور - یکتا بھوپالی - پروفیسر شور شاکر کلکتوی - شفقت کاظمی ۵۰
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۴

ملاحظات

سُرخ، زرد، سپید یہ ہیں تین خطرے جن سے دُنیا اس وقت دوچار ہے، زرد خطرہ (چین کا) تو حال ہی میں رونما ہوا ہے، لیکن سُرخ و سپید (یعنی روسی و امریکی) خطرہ جس نے کرۂ زمین کو عرصہ سے سرد جنگ میں مبتلا کر رکھا ہے نئی چیز نہیں اور ان کے دور ہونے کی تمنا خود انھیں بھی ہے، لیکن یہ آرزو کیونکر پوری ہو، ان کی سمجھ سے باہر ہے

اس وقت دنیا کا سیاسی مذہب علٰحدہ علٰحدہ دو جماعتوں میں منقسم ہے اور دونوں ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کر رہے ہیں نتیجہ کیا ہوگا، اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، تاہم دونوں کے موجودہ موقف کو سامنے رکھ کر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پچھلی چوتھائی صدی میں اشتراکیت یا شیوعیت نے بہت زیادہ قوت حاصل کر لی ہے جو حزب جمہوریت کے لئے یقیناً بڑے خطرہ کی بات ہے۔ ذیل کے نقشے سے آپ کو معلوم ہو سکے گا کہ اس وقت دُنیا کی آبادی کس نسبت سے ان دونوں جماعتوں میں منقسم ہے اور انکی عسکری قوت کیا ہے

۱- حزب جمہوریت سے منسلک ہونے والے ممالک کی فہرست یہ ہے :-

امریکہ - میکزیکو - کناڈا - گرین لینڈ - انگلستان - فرانس - اٹلی - اسپین - پرتگال - لیبیا - ترکی - ملایا - آسٹریلیا - جزائر فلپین و فاموسا - جنوبی کوریا - جاپان -

۲- حزب اشتراکیت میں قابل ذکر صرف ذیل کے ممالک شامل ہیں :-
روس - چین - برما اور وسط یورپ کے بعض ممالک -

ظاہر ہے کہ حزب جمہوریت میں متعدد ممالک شامل ہیں اور حزب شیوعیت میں بہت کم، لیکن رقبۂ آبادی اور عسکری قوت کے لحاظ سے دیکھئے تو یہ عدم توازن بالکل ختم ہو جاتا ہے:

رقبۂ اشتراکیت

روس = ۸۰ لاکھ مربع میل
چین = ۳۰½ لاکھ مربع میل
دوسرے ممالک = ۲۰ لاکھ مربع میل
میزان = ایک کرور ۳۰ لاکھ ۵۰ ہزار مربع میل

رقبۂ جمہوریت

امریکہ = ۳۰ لاکھ مربع میل
دوسرے ممالک = ایک کرور ۸۰ لاکھ مربع میل
میزان = ۲ کرور ۱۰ لاکھ مربع میل

آبادی اشتراکیت

روس = ۲۰ کرور
چین = ۶۲ کرور ۲۵ لاکھ
دوسرے ممالک = ۱۲ کرور ۵۰ لاکھ
میزان = ۹۴ کرور ۷۵ لاکھ

آبادی جمہوریت

امریکہ = ۱۷ کرور ۵۰ لاکھ
دیگر ممالک = ۴۷ کرور ۵۰ لاکھ
میزان = ۵۸ کرور

عسکری قوت

اشتراکی عسکری قوت

روس = ۳ کرور
چین = ۳ کرور ۲۰ لاکھ
دوسرے ممالک = ۲½ کرور
میزان = ۸ کرور ۷۰ لاکھ

جمہوری عسکری قوت

امریکہ = ۲ کرور ۶۰ لاکھ
دوسرے ممالک = ۴ کرور ۲۰ لاکھ
میزان = ۶ کرور ۸۰ لاکھ

یعنی آبادی اور عسکری قوت کے لحاظ سے اشتراکیت کا پلہ بھاری ہے اور رقبہ کے لحاظ سے باندازۂ ۸۰ لاکھ مربع میل جمہوریت کا۔ لیکن اصل چیز رقبۂ زمین نہیں بلکہ آبادی ہے، اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ اشتراکیت کے ماننے والے اس وقت بہ نسبت جمہوریت پسندوں کے زیادہ ہیں اور ان کی فوجی طاقت بھی زیادہ ہے۔

پھر اسی کے ساتھ اگر آپ اس حقیقت کو بھی سامنے رکھیں کہ اشتراکیت کی یہ مقبولیت پچھلی جنگ عظیم کے بعد سے شروع ہوتی ہے، (جس کو ۲۰ سال سے زیادہ زمانہ نہیں گزرا) تو یہ بھی باور کیا جا سکتا ہے کہ آیندہ چوتھائی صدی میں وہ کرۂ زمین کے بہت بڑے حصہ پر چھا جائے گی اور جمہوریت کا دائرہ زیادہ تنگ ہو جائے گا۔ پھر ہم آپ تو اس مسئلہ کو غیر جانبدارانہ حیثیت سے دیکھتے ہیں، لیکن امریکی بلاک کے لئے یہ موت و زیست کا سوال ہے اور اس لئے وہ اپنے موجودہ موقف کی حفاظت میں ناخن و چنگال کی پوری قوت اور انتہائی

احتیاط سے کام لے رہا ہے۔

روس و امریکہ کی مسابقت اس وقت گویا گھوڑ دوڑ کی سی مسابقت ہے جس میں دو گھوڑے کنوٹی سے کنوٹی ملائے دوڑ رہے ہوں اور ان میں سے ہر ایک آگے بڑھ جانے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ جس حد تک صنعت و حرفت اور دولت و ثروت کا تعلق ہے، امریکہ، روس سے آگے ہے گو سائنس کی ترقی میں وہ یقیناً روس سے پیچھے ہے۔ اس لئے اب روس کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ وہ صنعت و حرفت میں امریکہ کے دوش بدوش آجائے اور امریکہ اس جد و جہد میں لگا ہوا ہے کہ وہ سائنس میں روس کی سطح تک پہونچ جائے۔

یہ دونوں باتیں ناممکن نہیں لیکن عملی حیثیت سے اس قدر آسان بھی نہیں خاصکر روس کے لئے کہ اس کے سامنے بہ نسبت امریکہ کے زیادہ موانع حایل ہیں۔ کیونکہ روس صنعت و حرفت میں اس کے سامنے بہ نسبت امریکہ کی سطح تک پہونچ سکتا ہے، جب وہ اپنے فوجی طیاریوں سے ہٹ کر اپنی ساری قوت و دولت صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے وقف کردے، لیکن امریکہ سائنسی ترقی میں روس کی سطح تک پہونچنے کے لئے اس پر مجبور نہیں کہ وہ اپنی صنعتی جد و جہد کم کردے۔

یہی دل کا چور دونوں طرف اپنا کام کر رہا ہے اور ان میں ہر ایک اس منزل پر ہے جسے انگریزی میں :- (Enough we Know each other) کہتے ہیں۔

روس سمجھتا ہے کہ آیندہ جنگ کے لئے (جو بالکل سائنس کی جنگ ہوگی) وہ پوری طیاری کر چکا ہے اور اب ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ صنعتی ترقی کی طرف متوجہ ہو، اسی لئے وہ چاہتا ہے کہ سرد جنگ کے خطرہ سے آزاد ہو جائے اور اطمینان کے ساتھ صنعتی ترقی کی طرف لگ جائے اور یہی اصل مقصد تھا جسے خرشچیف لے کر امریکہ آئے تھے۔ لیکن چونکہ امریکہ بھی روس کی ان چالوں سے واقف ہے اس لئے خرشچیف خاطر خواہ کامیاب نہیں ہوئے، اور اگر صدر امریکہ اسی سلسلہ میں ماسکو گئے (جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے) تو بھی امید نہیں کہ آٹمی تجربات اور اسلحہ سازی کے ختم کر دینے پر امریکہ راضی ہو جائے گا اور سرد جنگ کا یہ دور جو روس کے لئے زیادہ نقصان رساں ہے، ختم ہو سکے گا۔

اس کا سب سے پہلا اور بڑا سبب یہ ہے کہ ان دونوں میں کسی کو دوسرے پر اعتماد نہیں خصوصیت کے ساتھ امریکہ، روس کی طرف سے زیادہ بدظن ہے، کیونکہ اگر آج دونوں میں آیندہ اسلحہ سازی بند کر دینے کا معاہدہ ہو جائے تو بھی روس بہت بڑا ملک ہے اور سائبیریا و قطب شمالی کے بعض حصے اتنے پوشیدہ ہیں کہ وہاں کے صحیح حالات کا پتہ چلنا مشکل ہے، برخلاف اس کے امریکہ کے ہر گوشہ میں آسانی سے پہونچ کر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔

ہر چند روس نے سیاحوں کے لئے اب کافی آسانیاں پیدا کر دی ہیں لیکن اس کے آہنی پردہ کی روایات پوری طرح ختم نہیں ہوئیں اور نہ ہو سکتی ہیں، کیونکہ سرزمین روس کے وہ حصے جہاں آٹمی اسلحہ طیار کئے جاتے ہیں اب تک نگاہوں سے پوشیدہ ہیں اور وہاں تک ہر شخص کا پہونچنا ممکن نہیں — بہرحال خرشچیف کی آمد امریکہ کے بعد بھی دنیا وہیں ہے جہاں پہلے تھی، لیکن اس کا امکان ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ اگر یہ کوشش اسی طرح جاری رہی اور امریکہ کو روس کی صاف دلی کا کسی وقت یقین ہو گیا تو حالات بدل جائیں گے کیونکہ امریکہ اپنی جگہ لاکھ مطمئن ہو، لیکن برطانیہ و فرانس وغیرہ (چونکہ روس سے قریب تر واقع ہیں اور بصورت جنگ ان کی پوزیشن زیادہ خطرہ میں ہے) صحیح معنی میں اسی وقت مطمئن ہو سکتے ہیں جب آٹمی تجربات اور آٹمی اسلحہ کی طیاریاں بند کر دی جائیں اور ہو سکتا ہے کہ ان کی رعایت یا دباؤ سے امریکہ کو کسی وقت زیادہ سنجیدگی سے روس کی پیشکش پر غور کرنا پڑے اور کوئی صورت باہمی مفاہمت کی نکل آئے، ورنہ ظاہر ہے کہ یہ سرد جنگ عرصہ تک قایم نہیں رہ سکتی اور اگر باہمی تناؤ یہی رہا تو یقیناً ایک وقت ایسا آئے گا جب موجودہ اقتصادی عدم توازن نہ صرف مغربی ممالک بلکہ ساری دنیا کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے گا اور دنیا ایک نہایت مہیب جنگ میں مبتلا ہو کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگی

مطبوعہ طلسم ہوشربا

(راز یزدانی)

طلسم ہوشربا۔ ایرج نامہ اور صندلی نامہ کے مطالعہ سے مجھے یہ یقین ہوگیا تھا کہ اُردو داستانوں میں طلسم ہوشربا سب سے پہلی داستان ہے جو کسی دوسری زبان سے ترجمہ ہوکر نہیں آئی۔ اس کے بعد قمر لکھنوی نے جتنے طلسم لکھے۔ یعنی طلسم فتنۂ نور افشاں طلسم ہفت پیکر۔ طلسم خیال سکندری۔ طلسم نوخیز جمشیدی اور قمر لکھنوی اور شیخ تصدق حسین کا مشترکہ لکھا ہوا طلسم زعفران زار سلیمانی یہ سب اُردو ادب کی اپنی داستانیں ہیں لیکن ضیاء الابصار جلد چہارم بوستان خیال میں صفحہ (۴۰۵) پر مترجم نے افراسیاب جادو ملکہ حیرت جادو۔ چرخ گرداں۔ چرخ گرداں۔ دامہ وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے جو طلسم ہوشربا کے خاص کیرکٹر ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بوستانِ خیال کے لکھے جانے وقت (۱۱۷۰ھ - ۱۱۵۵ھ) میں طلسم ہوشربا موجود تھی، لیکن بوستانِ خیال جلد چہارم کا مخطوطہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خیال نے ان جادوگروں کے نام نہیں لکھے تھے اور یہ اضافہ مترجموں کا ہے۔

طلسم ہوشربا کی تصنیف کے سلسلہ میں متعدد نام ہمارے سامنے آتے ہیں لیکن اس میں کلام نہیں کہ اس کے اولین مصنف میر احمد علی تھے۔ میں نے میر احمد علی صاحب کے حالات جاننے کی بڑی کوشش کی مگر افسوس ہے کہ اس کے علاوہ کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ موصوف نواب یوسف علی خاں ناظم کے عہد میں (۱۸۵۵ء سے ۱۸۶۵ء تک) رام پور آگئے تھے اور داستان گویوں کے زمرہ میں ملازم تھے۔ ساٹھ روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ میر صاحب اپنے عہد کے استادوں میں شمار ہوتے تھے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ لکھنؤ میں داستانگوئی کو فروغ ان کی ذات سے ہوا۔ لکھنؤ کے مشہور شاعر جلال لکھنوی کے والد حکیم اصغر علی خاں داستان گوئی میں میر صاحب موصوف کے شاگرد تھے ایک اور شاگرد منشی انبا پرشاد رسا بھی تھے۔ یہ تو مجھ سے بعض معمر رسیدہ لوگوں نے کہا کہ میر احمد علی کا انتقال بھی رام پور میں ہوا لیکن ان کی قبر کی نشاں دہی کوئی نہ کرسکا۔ کوئی یہ بتا سکا کہ کس عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ گو قیاس غالب یہ ہے کہ وہ بوڑھے ہوکر مرے بہرحال یہی میر احمد علی طلسم ہوشربا کے مصنف تھے۔

نولکشور پریس میں کیا چیز ترجمہ ہوئی؟ داستانِ حمزہ صاحبقراں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نوشیرواں نامہ سے صندلی نامہ تک نولکشور پریس نے جو ترجمے شائع کئے انھیں مشکل ہی سے ترجمہ کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی بڑی بڑی لائبریریوں اور دنیا کے مشہور کتاب خانوں میں اتنے ضخیم فارسی کے مخطوطے پوری تفصیل کے ساتھ موجود نہیں اور یہ تسلیم کرلینا ممکن نہیں کہ ذخیرہ صرف منشی نولکشور کے ہاتھ آیا۔

رام پور میں داستان کے فارسی مخطوطات کا جو کام ہوا ہے وہ زیادہ تر نواب محمد سعید خاں (۱۸۴۰ء سے ۱۸۵۵ء) اور نواب یوسف علی خاں ناظم (۱۸۵۵ء سے ۱۸۶۵ء تک کا ہے یعنی ہم اس کی ابتدا ۱۸۴۰ء اور انتہا ۱۸۵۵ء مقرر کرسکتے ہیں اور یہ کام زیادہ تر میر قاسم علی اور میر احمد علی کے قلم سے ہوا ہے اور "رموز حمزہ" کو بنیادی پتھر مان کر یہ عمارت بڑھائی گئی ہے۔

داستان گوئی کے سلسلہ میں لکھنؤ سے دربار رام پور کے تعلقات ظاہر ہیں۔ لکھنؤ کے بڑے بڑے داستان گو یعنی میر احمد علی، میر قاسم علی، میر نواب وغیرہ دربار رام پور سے متوسل رہے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ رموز حمزہ کے بعد داستان کو آگے بڑھانے کا خیال دربار رام پور میں پیدا ہوا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خیال رام پور کے نوابین کا ذاتی خیال تھا۔ گو یہ تمام کتابیں یہی بتاتی ہیں کہ ان کو نوابان رام پور کی حسب فرمایش مرتب کیا گیا لیکن یہ اس زمانہ کی ایک عام رسم تھی کہ ہر لکھنے والا کسی دربار میں ہوتا تھا تو اپنی کتاب کو فرمایش دربار سے ہی منسوب کرتا تھا۔ بہرحال ۱۸۴۰ء سے ۱۸۶۵ء تک وہ زمانہ ہے جس میں اردو کا کوئی ترجمہ کسی پریس سے شایع نہیں ہوا اور رام پور ہی میں فارسی مخطوطات اور بعض ترجمے مرتب کئے گئے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ جو کچھ مرتب ہوا اور داستان حمزہ صاحبقراں میں جتنا اضافہ ۱۸۴۰ء سے ۱۸۶۵ء تک ہوا وہ تنہا رام پور کا مال ہے کیونکہ یہ سب کچھ جن داستان گویوں کی رہین منت ہے وہ رام پور آکر داستان گو نہیں بنے تھے بلکہ داستان گوئی کا کمال اور دربار رام پور میں داستان کا شوق انھیں رام پور لایا تھا اس لئے ممکن ہے کہ داستانِ حمزہ میں "رموز حمزہ" کے بعد جو بڑھایا گیا ہے وہ ملک کے داستان کہنے والوں کا اپنا مال ہو۔ کسی نے کچھ بڑھایا کسی نے کچھ، لیکن صحیح طور پر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ داستان حمزہ کو مرتب کرنے اور اردو میں اس کے ترجمہ کا خیال سب سے پہلے رام پور میں پیدا ہوا۔ اور ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ میر احمد علی کے شاگردان خاص حکیم سید اصغر علی خاں اور انبہ پرشاد رسا لکھنوی اسی خدمت پر مامور تھے اور بعد کو حکیم اصغر علی خاں کے مشہور بیٹے حکیم ضامن علی جلال لکھنوی بھی اس داستان کو اردو میں منتقل کرنے پر ہی ملازم ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جلال لکھنوی ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء میں بائیس سال کے سن میں رام پور آگئے تھے۔

ان تاریخی حالات کو دیکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ اس عہد میں داستان حمزہ جس قدر اور جس صورت میں بیان کی جاتی تھی اسے فارسی میں مرتب کرنے اور فارسی سے اردو میں منتقل کرنے کا خیال نول کشور پریس سے پہلے رام پور میں پیدا ہوا اور ممکن ہے کہ ۱۸۵۶ء کے بعد یہ خیال رام پور سے لکھنؤ پہونچا ہو کیونکہ ان تمام داستانِ گویوں کے عزیز اور اقارب لکھنؤ میں تھے اور برابر ان سب کا آنا جانا رہتا تھا۔

داستان حمزہ کے پہلے مترجم شیخ تصدق حسین بے پڑھے لکھے تھے اور کاتبوں کو بول کر لکھواتے تھے، لہذا یہ تصور کرنا کہ ان کی داستان کسی فارسی مسودے پر مبنی تھی یا فارسی سے براہ راست ترجمہ تھی درست نہیں۔ حقیقت یہ کہ اس زمانہ میں داستانِ حمزہ جس طرح بیان کی جاتی تھی اسی طرح انھوں نے منشیوں کو لکھوا دی لیکن صندلی نامہ کے مترجم مولوی محمد اسمٰعیل اثر نے ایک اور بیان دیا ہے:-

> "جناب مرحوم (مراد منشی نولکشور سے ہے) نے اس حقیر سے ارشاد فرمایا کہ ہرچند داستان حمزہ صاحبقراں کے کئی دفتروں کا ترجمہ ہوا ہے اور جلدیں اس کی مطبوع ہو کر منظور نظر ناظرین والا تمکین ہوئی ہیں... ایک دفتر کا ترجمہ تجھ سے متعلق کیا جائے ... دفتر صندلی نامہ احقر کے سپرد فرمایا۔ اور شیخ تصدق حسین صاحب سے جن کے اہتمام سے نوشیرواں نامہ، کوچک باختر، بالا باختر و ایرج نامہ ترجمہ ہوئے ہیں اصل دفتر منگوا کر عاصی کو مرحمت کیا۔ (صفحہ ۳ صندلی نامہ)

لیکن یہ اصل دفتر کیا تھا اس کا پتہ نہیں چلتا، غالباً وہ رموز حمزہ تھا، لیکن رموز حمزہ کے مقابلہ میں موجودہ دفتروں کی ضخامت بہت زیادہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ "رموز حمزہ" کے ہندوستان پہونچنے کے بعد سے اشاعت کا کام شروع ہونے تک بڑے مشہور داستان گو کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے رہے ہوں۔

رموز حمزہ میں صندلی نامہ کے بعد ساتواں دفتر چند صفحات پر مشتمل ہے جن کی تعداد کل ۲۵ ہے اور اسی میں بدیع الملک (غیرہ کا ذکر ہے اب داستان حمزہ کو دیکھئے تو پتہ چلتا ہے کہ صندلی نامہ کے بعد۔ تورج نامہ دو جلد صفحات ۲۰۲۴۔ لعل نامہ، دو جلد صفحات ۱۸۰۰

دفتر آفتاب شجاعت پانچ جلد تعداد صفحات ۵۲۱۲ - گلستان باختر تین جلد تعداد صفحات ۲۱۶۲ — کل ۱۱۲۳۸ صفحات ہیں — یہ رموز حمزہ کے ۲۵ صفحوں یا اسکے پانچ دفتروں کا محض ترجمہ تو نہیں تسلیم کئے جاسکے جبکہ رموز حمزہ کا چھٹا دفتر جس کا صندلی نامہ کہا گیا ہے کل پانچ جزو کا ہے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ لکھنؤ سے داستان کی اشاعت کا جو کام ہوا ہے اسے ترجمہ احراماً کہا گیا ہے۔ اصل میں یہ داستانِ حمزہ کی وہ صورت ہے جس میں اس عہد کے داستان گو اسے بیان کرتے تھے۔

طلسم ہوشربا مصنفہ میر احمد علی لکھنوی

مطبوعہ طلسم ہوشربا کی پانچویں اور چھٹی جلد میں اصل طلسم ہوشربا کے متعلق قمر لکھنوی کا بیان دیکھ کر مجھے یہ جستجو پیدا ہوئی کہ وہ طلسم ہوشربا کہاں ہے جو میر احمد علی کی تصنیف ہے اور جس کے کچھ منتشر اجزا قمر لکھنوی کی نظر سے گزرے۔ رام پور لائبریری کے قلمی ذخیرے میں تلاش کرنے سے مجھے یقین ہوگیا کہ میر احمد علی کی بیان کردہ طلسم ہوشربا کا ملنا آسان نہیں ہے البتہ اس کا اسلوب ضرور معلوم ہوگیا اور وہ یہ ہے کہ منشی غلام رضا ابن منشی انبہ پرشاد ولد منشی چندی پرشاد المتوفی ۱۳۰۵ھ نے طلسم ہوشربا کے نام سے دو سلسلے لکھے تھے ایک طلسم ہوشربائے باطن کے نام سے چار جلدوں میں اور دوسرا طلسم باطن ہوشربا کے نام سے دس جلدوں میں۔ طلسم باطن ہوشربا کی پہلی جلد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

اس کے اصل مصنف میر احمد علی تھے، میر احمد علی سے وہ طلسم منشی انبہ پرشاد رسا کو پہونچا اور رسا سے ان کے بیٹے غلام رضا کو پہونچا - ان کتابوں کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منشی غلام رضا نے ان (۱۴۲۶) صفحات میں جو کچھ لکھا ہے وہ وہی طلسم ہوشربا ہوسکتا ہے جسے میر احمد علی کی تصنیف کہا تھا۔

طلسم ہوشربائے باطن اور طلسم باطن ہوشربا کی تفصیل یہ ہے :-

نمبر شمار	نام	تعداد صفحات	سن تصنیف	سن کتابت	نام مصنف
۱	طلسم باطن ہوشربا	۳۰۸	۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء عہدِ نواب کلب علی خاں	۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء	منشی غلام رضا ابن انبہ پرشاد رسا
۲	جلد ۲ 〃	۴۰۸	۱۸۷۶ء	۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء	〃
۳	جلد ۳ 〃	۴۵۷	۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء	۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء	〃
۴	جلد ۴ 〃	۴۹۵	〃	〃	〃
۵	جلد ۵ 〃	۴۸۴	۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء	۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء	〃
۶	جلد ۶ 〃	۴۸۸	〃	〃	〃
۷	جلد ۷ 〃	۴۸۰	〃	〃	〃
۸	جلد ۸ 〃	۵۷۵	۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء	۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء	〃
۹	جلد ۹ 〃	۳۷۵	〃	〃	〃
۱۰	جلد ۱۰ 〃	۴۶۵	۱۸۸۰ء	۱۸۸۰ء	〃
	۱۰	۴۵۳۶	۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۰ء تک / ۱۲۹۳ھ سے ۱۲۹۶ھ تک	تقریباً ۵ سال	

مرزا علیم الدین رام پوری کی طلسم ہوشربا

یہ طلسم مرزا علیم الدین رام پوری کا تحریر کردہ ہے۔ مرزا صاحب مرزا رحیم الدین حیا کے - جو بہادر شاہ کے رشتہ کے بھانجے تھے۔ مرزا علیم الدین صاحب عالم کی پیدائش تو دہلی کی تھی لیکن ۱۸۵۷ء میں بعمر دو سال اپنے باپ مرزا رحیم الدین حیا کے ساتھ رام پور آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ تقریباً ۸۰ برس کی عمر پاکر انتقال کیا۔ (۱۳۴۵ھ) دربار سے ساٹھ روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی جو تادم آخر ملتی رہی - - - - - - - - یہ داستان گویوں کے زمرہ میں ملازم تھے۔ تعلیم گھریلو تھی۔

مرزا صاحب کو اپنے بچپن ہی سے داستان سننے اور داستان کہنے کا شوق تھا چنانچہ وہ کمسنی ہی میں میر نواب مشہور داستان گو کے شاگرد ہو گئے تھے۔ مرزا صاحب کی قبر محلہ شترخانہ میں اصطبل کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد کے ملحقہ قبرستان میں ہے۔

مرزا صاحب نے اُردو داستان گوئی کو حسب ذیل ذخیرہ دیا ہے جو رضا لائبریری کے اردو مخطوطات کی زینت ہے:-

(۱) بہارستانِ مثال ۵ جلدوں میں ۱۳۰۴-۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۶-۹۰ء میں ضخامت ۲۴۳۰ صفحات

(۲) تورج نامہ، ایک جلد سن تصنیف تحریر نہیں، ضخامت ۴۳۲ صفحات

(۳) طلسم ہوشربا طاق سکندری دو جلدوں میں سن تصنیف تحریر نہیں ضخامت ۷۵۰ صفحات

(۴) طلسم باطن ہوشربا - اس تفصیل سے

(الف) پہلی جلد - ۱۳۳۱-۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۲-۱۳ء میں ضخامت ۲۱۹ صفحات

(ب) جلد ۲ و ۳ - 〃 〃 〃 ۱۲/۸۸ 〃

(ج) جلد ۴ - 〃 〃 〃 ۳۵۲ 〃

(د) جلد ۵ - 〃 〃 〃 ۴۲۲ 〃

(ھ) جلد ۶ - ۱۹۱۶ء 〃 〃 ۴۱۶ 〃

(و) جلد ۷ - 〃 〃 〃 ۴۵۶ 〃

(ز) جلد ۸ - 〃 〃 〃 ۴۰۰ 〃

گویا طلسم باطن ہوشربا آٹھ جلدوں میں ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۸ء تک۔ کل ضخامت ۲۳۷۹ صفحات

(۵) طلسم زلزال متعلقہ طلسم باطن ہوشربا چار جلدوں میں جس کی تفصیل یوں ہے:-

(الف) پہلی جلد - ۱۹۱۸ء میں - ۴۰۸ صفحات

(ب) دوسری جلد - ۱۹۱۸-۱۹ء 〃 - ۴۹۰ 〃

(ج) تیسری جلد - ۱۹۱۹ء 〃 - ۴۸۰ 〃

(د) چوتھی جلد 〃 〃 - ۵۱۲ 〃

چار جلدیں ۱۹۱۸ء و ۱۹۱۹ء میں کل ۱۸۱۰ صفحات میں

(۶) طلسم آذر کیوان عرف طلسم پری پیکر اس تفصیل سے:-

(الف) پہلی جلد - ۱۹۱۹-۲۰ء میں ضخامت ۴۳۲ صفحات

(ب) دوسری جلد - ۱۹۲۰ء 〃 〃 ۵۲۰ 〃

(ج) تیسری جلد - 〃 〃 〃 ۴۸۰ 〃

(د) چوتھی جلد - ۱۹۲۱ء 〃 〃 ۴۸۰ 〃

(ھ) پانچویں جلد - ۱۹۲۱ء میں ضخامت ۴۸۰ صفحات
پانچ جلدیں دو سال یعنی ۱۹۲۰-۲۱ء میں کل صفحات ۲۳۹۲
(۷) طلسم معدنِ غرائب عرف ہفت گلزار سلیمانی ۱۹۲۲ء میں ایک جلد ضخامت ۴۲۴ صفحات
(۸) طلسم لالہ زار متعلقہ ہوشربا ایک جلد ۱۹۲۳ء میں ضخامت ۵۱۱ صفحات
(۹) طلسم چاہ زمرد متعلقہ ہوشربا ایک جلد ۱۹۲۵ء میں ضخامت ۳۰۵ صفحات

گویا مرزا علیم الدین نے اُردو داستانوں کے ۹ سلسلے لکھے جو ۱۸۸۵ء سے شروع ہوکر ۱۹۲۵ء میں ختم ہوئے یعنی چالیس سال وہ لکھتے رہے۔ انتقال سے دو سال پہلے ان کا قلم رُکا اور ۳۲ برس کی عمر سے انھوں نے لکھنا شروع کیا۔ ۲۷ جلدوں میں لکھا اور دس ہزار پانچ سو اکسٹھ صفحے لکھے۔

کچھ داستان نویسوں کے حالات

جاہ لکھنوی جاہ لکھنوی کا نام محمد حسین تھا۔ یہ داستان گوئی میں لکھنؤ کے مشہور داستان گو منشی فدا علی کے شاگرد تھے۔ منشی فدا علی کو لوگ بڑے منشی جی کہتے تھے اور جاہ کو چھوٹے منشی جی۔ ہوشربا کی چوتھی جلد لکھنے کے بعد منشی نول کشور سے معاوضہ کے متعلق جاہ کا جھگڑا ہوگیا اور جاہ، نول کشور پریس کی ملازمت ترک کرکے منشی گلاب سنگھ لاہور والے کے مطبع میں چلے آئے جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں تھا۔ منشی گلاب سنگھ سے اتنی بڑی کتاب یعنی ہوشربا کی پانچویں جلد کے فوراً چھپوانے کا اہتمام نہ ہوسکا، انھوں نے اس کا چھوٹا سا حصہ غالباً دو ڈھائی سو صفحوں کا چھپوایا ہے (یہ حصہ میں نے اپنے بچپن میں دیکھا ہے) لیکن منشی نولکشور کو قمر لکھنوی مل گئے جو زود نویس تھے، انھوں نے فوراً ہی قمر لکھنوی سے پانچویں جلد کا پہلا حصہ لکھوا کر شایع کر دیا یہ حصہ جاہ کے لکھے ہوئے حصہ سے زیادہ بڑا اور جامع تھا اس لئے لوگ پھر نولکشور پریس کی طرف متوجہ ہوگئے اور جاہ کا کام آگے نہیں چل سکا۔ اس کے بعد نہیں معلوم کہ جاہ پر کیا گزری اور کن حالات میں اور کب ان کا انتقال ہوا۔

ہوشربا کی چاروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہ لکھنوی پڑھے لکھے آدمی تھے، بوستانِ خیال کے تتبع میں انھوں نے جابجا طلسم کشائی کے موقعوں پر علم رمل - نجوم - جفر اور دیگر علوم سے اپنی واقفیت کا اظہار کیا ہے اور ان کے تصنیف کئے ہوئے ساقی ناموں سے بھی ان کے اہلِ علم ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

قمر لکھنوی قمر لکھنوی کا نام منشی احمد حسین تھا۔ چھٹی جلد کے آخر میں انھوں نے جو مختصر سے حالات اپنے لکھے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فن داستان گوئی میں کسی کے شاگرد نہ تھے، ان کے بزرگ عہدِ شاہی میں موقر عہدوں پر ملازم رہے۔ ہندستان کی پہلی جنگ آزادی یعنی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ان کے دو بھائی شہید ہوئے۔ بعد کو انھوں نے اپنی زندگی کے کاروبار کو چلانے کے لئے وکالت کی سند حاصل کرنا چاہی مگر ناکام رہے اس ناکامی کے وجوہ کو وہ چند در چند کہکر ٹال گئے ہیں، قیاس ہوتا ہے کہ ۵۷ء کے ہنگامہ میں دو بھائیوں کا شہید ہوجانا، سرکار انگریز کے لئے انھیں باغیوں میں سمجھنے کے واسطے کافی ہوا ہوگا اور سند نہیں مل سکی ہوگی۔ مجبور ہوکر انھوں نے داستان گوئی اختیار کی۔ ان کا بیان ہے دفاتر داستان حمزہ مرتبہ ملا فیضی نولکشور پریس میں تھے۔ اپنے متعلق بھی انھوں نے لکھا کہ نوشیرواں نامہ سے لعل نامہ تک سب دفاتر خود ان کے مرتب کردہ ان کے پاس موجود ہیں۔ ان کے بیٹے منشی اشتیاق حسین سہیل نے اپنی ایک تقریظ میں ان کی تاریخ انتقال ذیقعدہ ۱۳۱۸ھ لکھی ہے اور خواجہ عشرت لکھنوی نے ۱۹۰۱ء میں ان کا انتقال بتایا ہے اور ۱۳۱۸ھ بھی مطابق ہوتا ہے فروری ۱۹۰۱ء کے۔ قمر کی سکونت درگاہ حضرت عباس کے قریب تھی۔

میر احمد علی لکھنؤ میں ان کی استادی کا ڈنکہ بجتا تھا۔ طلسم ہوشربا کے اصل مصنف یہی ہیں عہد نواب یوسف علی خاں ۹۵-۱۸۴۹ء میں رام پور آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے، ان کے دو شاگرد انبہ پرشاد رسا اور حکیم اصغر علی خاں، جلال لکھنوی کے والد داستان گوئی میں مشہور رہے۔

حکیم اصغر علی خاں میر احمد علی کے شاگرد۔ عہدِ نواب محمد سعید خاں میں رام پور آئے اور داستان گویوں کے زمرہ میں ملازم ہوئے، انتقال ۱۲۹۶ھ میں ہوا۔

حکیم میر ضامن علی جلال لکھنوی حکیم اصغر علی خاں کے بیٹے ۱۸۸۰ء میں جب ۲۲ برس کے تھے نواب یوسف علی خاں نے فارسی سے داستان کے اردو ترجمہ کے لئے ان کے والد کی سفارش پر ان کو رامپور بلا لیا اور نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء میں ان کا اسٹیٹ سے پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ ہو گیا تھا جو تاحیات ملتا رہا۔ انتقال ۱۳۲۵ھ مطابق ۲۰ر اکتوبر ۱۹۰۷ء کو ہوا۔

محمد امیر خاں خواجہ عشرت لکھنوی ان کے متعلق لکھتے ہیں:- امیر خاں وزیر باغ کی کوٹھی میں بارہوں مہینے شہزادہ ایرج کا حال سنایا کرتے تھے، ہر بدھ کو ان کی داستان ہوا کرتی تھی ان سے بڑھ کر عیاری کوئی نہ بیان کرتا تھا لیکن وہ منشی صاحب کے یہاں نہیں گئے (مراد نولکشور سے ہے) ان کو ناز تھا کہ ہماری عیاریاں اس حسن و خوبی سے کوئی نہیں لکھ سکتا داستانوں میں عمرو عیار کی جتنی عیاریاں ہیں سب امیر خاں کے بیان کا چربہ ہیں۔

مرزا کاظم حسین عرف مرزا حفو نواب یوسف علی خاں اپنے والد نواب محمد سعید خاں کے والی رام پور ہونے سے قبل ۱۸۴۰ء دہلی میں رہتے تھے۔ وہیں مرزا کاظم حسین سے اُن کے روابط پیدا ہوئے ۱۸۴۰ء میں نواب یوسف علی خاں ولی عہد رام پور کی حیثیت میں رام پور اور کچھ دنوں کے بعد دہلی گئے تو مرزا کاظم حسین کو اپنے ساتھ لیتے آئے۔ تھانہ حجیانی کے قریب ان کے خاندان کی پختہ عمارتیں اب تک موجود ہیں ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں انتقال ہوا اور رام پور میں اپنے محلوکہ مکان کے سامنے دفن ہوئے۔

میر نواب اپنے عہد کے مشہور داستان گو تھے چوک محمد سعید خاں میں مکان تھا، مرزا علیم الدین داستان گوئی میں ان ہی کے شاگرد تھے ۱۸۸۰-۸۵ء کے درمیان انتقال ہوا۔ شیعوں کے مشہور قبرستان باغ مہدی علی خاں متصل بلاسپور دروازہ میں دفن ہوئے۔

حیدر مرزا تصوّر میر نواب کے بیٹے تھے اور رام پور میں زمرہ داستان گویاں میں ملازم تھے ان کا انتقال بھی رام پور میں ہوا اور اپنے باپ کی قبر کے قریب دفن ہوئے۔

انبہ پرشاد رسا میر احمد علی کے شاگرد اور لالہ چندی پرشاد کایستھ کے بیٹے تھے رام پور میں اسلام اختیار کر لیا تھا۔ اسلامی نام عبدالرحمان تھا۔ نواب محمد سعید خاں کے عہد میں رام پور آئے تھے، تقریباً ستانوے برس کی عمر پائی اور انتقال ۸۵-۱۸۸۴ء کے درمیان ہوا۔

منشی غلام رضا منشی انبا پرشاد المعروف بہ عبدالرحمان کے بیٹے تھے دس برس کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ سے رامپور آئے اور اپنے باپ کے ساتھ ہی اسلام لائے ان کا عرف چھوٹے مرزا، رنگ سانولا اور دبرا جسم تھا، داڑھی منڈاتے تھے، ہر جمعہ کو ان کے یہاں داستان ہوتی تھی ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء میں بعمر اسی سال انتقال ہوا۔ مکان مسکونہ محلہ کٹرہ میں تھا۔

سید علی زیدی مرزا کھو بیگ لکھنوی کے بیٹے نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں رام پور آکر ملازم ہوئے نہیں ۸۶-۱۸۸۵ء میں انتقال ہوا اور شاہ رفیق کے تکیہ میں دفن ہوئے۔

سید حسین سید علی زیدی کے بیٹے تھے نواب حامد علی خاں کے عہد تک زندہ رہے، دو محلہ میں ان کا مکان تھا ہر جمعہ کو ان کے یہاں بھی جلسۂ داستان گوئی ہوتا تھا۔ انتقال ۱۸۹۰-۹۲ء کے درمیان رام پور میں ہوا۔

مرتضیٰ حسین وصالؔ شاعری میں جلالؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ شعر میں کوئی خاص بات نہیں، داستان گوئی میں البتہ کمال تھا۔ ان کی موت بڑے المناک طریقہ سے واقع ہوئی نواب حامد علی خاں اس زمانہ میں بے نظیر باغ میں مقیم تھے۔ یہ صبح کے وقت ہتنی پر سوار اپنے گھر آرہے تھے کہ موتی مسجد کے پاس ہتنی بھڑکی اور زیر موتی مسجد اوقاف کی جو دوکانیں ہیں ان میں گھس گئی، وصالؔ دوکان کی چھت اور ہتنی کی پیٹھ کے درمیان کچل کر مر گئے۔ فوج میں ان کا پہرہ تھا اور خدمت داستان گوئی کی سپرد تھی۔ انتقال ۱۹۰۰ء میں ہوا۔

مرزا امیر الدین عرف کلن مرزا مرزا رحیم الدین حیاؔ کے بیٹے اور مرزا علیم الدین کے بھائی تھے، کلن مرزا بے پڑھے لکھے تھے، لیکن داستان خوب کہتے تھے طلسم نورنگ خیال ان ہی کا کہا ہوا ہے جس کو ان کے چھوٹے بھائی مرزا ولی الدین نے لکھا ہے، ریاست رام پور میں ۱۹۳۷ء تک ملازم رہے۔ عمر کے آخری دو سال بڑی عسرت میں بسر کئے محلہ گھیر پیل والا میں اپنی بیٹی کے گھر ۱۹۳۹ء میں انتقال کیا اور اسی محلہ کے قبرستان میں دفن ہوئے، اکہرے جسم اور ناٹے قد کے سیاہ فام آدمی تھے، داڑھی رکھتے تھے۔

مرزا ولی الدین عرف ملّن مرزا ملّن مرزا بھی مرزا رحیم الدین حیاؔ کے بیٹے تھے شعر بھی کہتے تھے ان کی شاعری میں تو کوئی بات نہیں تھی البتہ شطرنج کے ملک گیر استادوں میں ان کا شمار تھا۔ میں نے بھی ان سے مشق کی ہے، آخر عمر میں اونچا بھی سننے لگے تھے اور بینائی بھی تقریباً جاتی رہی تھی مگر حافظے کا یہ عالم تھا کہ ہم امتحاناً چپکے سے ان کے مہرے کا خانہ بدل دیتے اور جب یہ اس مہرے کی چال چلتے تو ہاتھ اسی خانہ پر پڑتا جہاں وہ درحقیقت تھا۔ ہم لاکھ کہتے کہ استاد یہ فلاں خانے میں ہے۔ کسی طرح نہیں مانتے۔ کئی بار تو بگڑ کر جواب دیا کہ "میرے ہاتھ سے اور یہ گھوڑا، اس خانہ میں ممکن ہی نہیں"۔ ان کا انتقال ۲۹ جمادی الاخر ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء کو رام پور میں ہوا اور شاہ رفیق کے تکیہ میں دفن ہوئے۔ آخر عمر ان کی بھی ۴۷ء کے بعد سے بڑی تنگی اور ترشی میں بسر ہوئی۔ پھٹنگے قد کے سیاہ فام آدمی تھے، اکہرا جسم تھا اور داڑھی منڈاتے تھے۔

بعض نادر کتابیں

(چوتھائی قیمت پیشگی آنا ضروری ہے)

آئین اکبری ... تصحیح سرسید احمد خاں .. ۸۰ء
تاریخ فرشتہ ... محمد قاسم ... ۸۰ء
حدیقہ حکیم سنائی ۳۰ء
دیوان ظہوری ... نورالدین ... ۲۰ء
دیوان محتشم کاشانی ۲۵ء
کلیات سعدی شیرازی ۲۵ء
کلیات جلال اسیر ۲۵ء
کلیات صہبائی ... امام بخش ... ۱۰ء
کلیات ظہیر فاریابی ..... پتے

کلیات قاآنی .. مرزا حبیب شیرازی ۲۵ء
برہان قاطع .. محمد حسین ۸۰ء
بہار عجم - برہنج غیاث اللغات ٹیکچند بہار - ۸۰ء
دریائے لطافت .. انشاء اللہ خاں - ۳۰ء
غیاث اللغات .. غیاث الدین .. ۱۸۰ء
منتخب اللغات .. عبدالرشید ... ۲۰۰ء
نیو رواییل انگلش پرشین ڈکشنری .. ۲۰۰ء
صراح مع فرہنگ فرہنگ .. ابوالفضل - ۲۰۰ء
آنموس .. مجدالدین محمد ... ۷۰ء

مخزن نکات .. قیام الدین قائم ... ۵ء
تاریخ دکن ۲ جلد - سید علی بلگرامی ۵ء
وقایع راجستان ۲ حصے - نجم الغنی .. ۳۰ء
تاریخ نامہ مظفری - محمد مظفر حسین - ۳۵ء
تاریخ خسروان عجم - مولچند منشی ۱۵ء
حیات جاوید .. سوانح سرسید احمد خاں - ۲۵ء
جامع اللغات فارسی ۲ جلدیں - غلام سرور - ۸۰ء
ڈکشنری ہندوستانی و انگلش - ڈیکن فارس ۱۵ء
نفائس اللغات - اوحدالدین ... ۳۰ء

فلاسفہ کا تصورِ الٰہ

مسلمان فلاسفہ

(مسلسل)

(نواب محمد عباس طالب صفوی)

الفارابی ابو نصر محمد بن محمد بن اوزلغ بن طرخان، خراسان کے ایک شہر میں (غالباً ۲۵۹ھ) میں پیدا ہوا۔ اگرچہ اس کے دادا اور پردادا کے نام ترکوں کی طرح کے تھے اور اگرچہ اس کا مولد فاراب (ترکستان کا ایک شہر) تھا جو اُسوقت صوبۂ خراسان میں شامل تھا تاہم مسلمان مورخین نے یہی لکھا ہے کہ اس کا باپ ایرانی النسل تھا[۱]، وہ عنفوان شباب میں بغداد آگیا تھا لیکن وہ کس عمر میں بغداد آیا یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا، اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ وہ پندرہ برس کی عمر میں بغداد آیا تو وہ زمانہ معتمد کی خلافت کا تھا جو ۲۷۹ھ (۸۹۲ء) تک خلیفہ رہا[۲] اور جو اپنے باپ کی طرح علوم عقلیہ سے اتنا متنفر تھا کہ اپنے انتقال سے چند ماہ قبل بغداد کے کتب فروشوں سے حلف اُٹھوالیا تھا کہ وہ نہ صرف فلسفہ بلکہ علم کلام و مناظرہ کی بھی کوئی کتاب فروخت نہ کریں گے[۳]۔ چونکہ مشہور عرب فلسفی ابو یوسف یعقوب بن اسحٰق کندی کا انتقال معتمد کی وفات سے غالباً اٹھارہ برس قبل ہوچکا تھا[۴] اور فلاسفہ و معتزلہ، متوکل ہی کے زمانہ سے حکومتِ وقت کی سرپرستی سے محروم ہوچکے تھے، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ فارابی نے کسی مسیحی عالم یوحنا بن حیلان سے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی[۵] چنانچہ خود فارابی کا شاگرد بھی کوئی مسلمان نہ تھا بلکہ زکریا یحییٰ ابن عدی مسیحی یعقوبی تھا[۶]

مولانا عبدالسلام ندوی نے غالباً طبقات الحکماء کے حکایات سے متاثر ہوکر تحریر فرمایا ہے کہ فارابی دنیا کی ستر زبانیں جانتا تھا لیکن یہ یقینی ہے کہ وہ عربی - فارسی اور ترکی جانتا تھا اور غالباً یونانی اور سریانی سے بھی واقف تھا[۷] مگر اس کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم از کم یونانی زبان کے متعلق مولانا عبدالسلام ندوی کا حسن ظن صحیح نہیں ہے، اسی لئے وہ اپنے پیش رو

---

۱ "کتاب الجمع بین رائے الحکیمین" للفارابی، مطبوعۂ مصر صفحہ الف

۲ A Short History of the Saracens By Ameer Ali p. 296.

۳ تاریخ طبری جلد سوم حصہ سوم و چہارم مترجمۂ عبداللہ العادی صفحہ ۲۰۹

۴ "تاریخ فلاسفۃ الاسلام"، مصنفۂ محمد لطفی جمعہ صفحہ ۱

۵ "کتاب الجمع بین الرائے الحکیمین" مطبوعۂ مصر صفحہ ہ

۶ "تاریخ فلاسفۃ الاسلام"، صفحہ ۴۷

۷ "حکمائے اسلام حصہ اول" صفحہ ۱۲۵

الکندی کی طرح ارسطو کے صحیح فلسفہ سے ناواقف رہا۔ پھر یہی نہیں کہ فارابی صرف الٰہیات ارسطو سے بے خبر رہا بلکہ یونانی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے وہ تاریخ فلسفہ سے بھی ناآشنا رہا۔

اس وقت فارابی کے رسایل کے دو مجموعے میرے پیشِ نظر ہیں۔ پہلا مجموعہ المجموع کے نام سے مطبع سعادت مصر نے شایع کیا ہے اور اس میں چھ رسالے شامل ہیں، دوسرا مجموعہ دائرہ المعارف حیدر آباد دکن نے رسایل الفارابی کے نام سے شایع کیا تھا اور اس میں اس کے گیارہ رسایل شامل ہیں۔ ان دونوں مجموعوں میں اس نے نہ صرف الٰہیات کو نو افلاطونی رنگ میں پیش کیا ہے بلکہ تاریخ فلسفہ سے بھی کمال ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے، کبھی یہ ارشاد ہوا ہے کہ فلسفہ کا شیوع یونان کے بادشاہوں کے عصر میں ہوا[1] اور کبھی زینون کبیر کو ارسطو کا شاگرد ظاہر کیا ہے[2]۔ حالانکہ نہ ملوک یونان کو فلسفہ سے کوئی تعلق رہا ہے اور نہ ارسطو کے تلامذہ میں کسی زینون کبیر یا صغیر کا نام نظر آتا ہے[3]۔ اسی طرح اس نے خواہ مخواہ یہ بھی فرض کر لیا کہ افلاطون اور ارسطو معاد کے قایل تھے (یعنی ارسطو نے جو خط سکندر اعظم کے انتقال کے بعد اس کی ماں کو لکھا اس خط میں معاد کا اقرار کیا اور افلاطون نے سیاست پر جو کتاب تحریر کی اس کے آخر میں نہ صرف "بعث والنشور والحکم والعدل" کا اقرار کیا بلکہ میزان کے وجود کا بھی اعتراف کیا)[4]

حقیقتِ امر یہ ہے کہ فارابی نے سیاست مدن میں نو افلاطون اور ارسطو کی جمہوریت نامی کتابوں کو پیشِ نظر رکھا[5] لیکن الٰہیات میں اسی خالص نو افلاطونی نظریہ کو پیش کیا کہ خدا اشیاء کو خلق نہیں فرماتا بلکہ اشیاء خدا سے ظہور پذیر ہوتے ہیں[6]۔

نو افلاطونی الٰہیات سے یہ شغف فارابی سے مختص نہیں ہے بلکہ الکندی سے لے کر ابن رشد تک ہر مسلمان فلسفی نے جو کچھ تو کیا ہے افلاطون یا ارسطو کی پیروی کا لیکن تقلید کی ہے نو افلاطونیوں کی اور یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان فلسفی ارسطو کے تعلیمات کے برعکس کسی نہ کسی حد تک فلاطینس کی وحدۃ الوجود کا قایل تھا۔

لیکن اس اعتراف کے باوجود میں پروفیسر برٹرنڈرسل کی اس تحقیق سے متفق نہیں ہوں کہ چونکہ الکندی نے دیدہ و دانستہ فلاطینس کے نو رسایل کے اقتباسات کو الٰہیاتِ ارسطو کے نام سے پیش کیا تھا، اس لئے عرب دنیا صدیوں تک ارسطو کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا رہی[7]۔

میری رائے میں الکندی نے دیدہ و دانستہ فلاطینس کے الٰہیات کو ارسطو کے الٰہیات کے نام سے پیش نہیں کیا بلکہ جس طرح الکندی سے صدیوں قبل عیسائیوں نے بالعموم اور اسکندریہ اور شام کے عیسائیوں نے بالخصوص[8] فلاطینس کے رسایل کے آخری تین رسالوں کو نو افلاطونیوں کی تدلیس کی وجہ سے الٰہیاتِ ارسطو سمجھا[9]۔ اسی طرح الکندی نے ان عیسائیوں کی وجہ سے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ان

---

[1] "المجموع" مطبوعۂ مصر صفحہ ج

[2] "شرح رسالہ زینون الکبیر الیونانی" مطبوعہ حیدر آباد صفحہ ۳

[3] Aristotle By Prof. Ross page 296.

[4] "المجموع" مطبوعۂ مصر صفحہ ۳۸

[5] "کتاب السیاسات المدنیہ" مطبوعۂ حیدر آباد دکن صفحہ ۴۶ - ۴۹

[6] "کتاب الفصوص" مطبوعۂ حیدر آباد دکن صفحہ ۲۰

[7] A History of Western Philosophy page 443.

[8] "فلسفۂ اسلام" مصنفۂ اولیری مترجمۂ احسان احمد صفحہ ۳۳ - [9] حوالۂ سابق صفحہ ۱۲

تینوں رسایل کو عربی زبان منتقل کر دیا، اس لئے ارسطو کے فلسفہ کو مسخ کرنے کا الزام الکندی کے بجائے ان نو افلاطونیوں پر عاید ہوتا ہے جنھوں نے ارسطو کے فلسفہ میں اپنے نظریات کو داخل کیا۔

بہر نہج اس میں کوئی کلام نہیں کہ مسلمان فلاسفہ جس فلسفۂ یونان سے شروع میں واقف ہوئے وہ حقیقتاً نو افلاطونیوں کا مسخ کردہ فلسفہ تھا اور مسلمان فلاسفہ اس فلسفے سے واقف ہونے کے باوجود وہ فلسفۂ یونان کو ڈاکٹر قاسم غنی کے الفاظ میں "باچشم افلاطونیانِ جدید" دیکھتے رہے[1] اور یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان فلسفی کو کسی نہ کسی حد تک تصوف کا دل دادہ سمجھا گیا، چنانچہ الفارابی کے متعلق یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ آخر میں اُس نے صوفیانہ وضع اختیار کر لی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس کے انتقال کے بعد اُس کے مربی سیف الدولہ نے بھی اس کے سوگ میں صوفیہ کا لباس استعمال کیا[2] ابن سینا کے حالات میں یہ روایت موجود ہے کہ جب تین شبانہ روز کی رازدارانہ گفتگو کے بعد ابن سینا مشہور صوفی ابوسعید، ابوالخیر کے حجرے سے برآمد ہوا اور ابن سینا کے تلامذہ نے ابوسعید ابوالخیر کے متعلق استفسار کیا تو ابن سینا نے اسلامی فلسفہ اور اسلامی تصوف کی عینیت کی طرف ان بلیغ الفاظ میں اشارہ کیا "ہرچہ من دانم او بیند"[3] اور ابن رشد کا بھی یہ عالم تھا کہ اگرچہ موسیو رینان نے عقیدۂ وحدۃ الوجود پر سب و شتم کرنے کے بعد ابن رشد کے متعلق یہ الفاظ سپردِ قلم فرمائے ہیں "ابن رشد ہمیشہ ایسی حماقتوں سے الگ رہا اور بلاخوفِ تردید وہ تمام فلاسفۂ عرب اندلس میں سب سے کم تصوف فلاسفہ کی طرف مایل تھا"[4] لیکن صرف دو صفحے قبل انھیں موسیو رینال نے ابن رشد کے اس نظریہ کے بیان کے بعد کہ عقلِ انفعالی کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح عقلِ فعال سے وصل ہو جائے اور اس وصل کے بعد انسان خدا کے مانند ہو جاتا ہے، اسی ابن رشد کے لئے یہ الفاظ استعمال فرمائے ہیں: "یہاں ابن رشد بے قرار ہو کر کہنے لگتا ہے کہ کتنی محمود ہے یہ حالت اور کتنا عجیب ہے یہ طورِ زندگی"[5]

خود مسلمان فلاسفہ بھی یہ جانتے تھے کہ اُن تک ارسطو کی صحیح تعلیم نہیں پہونچی اور نہ صرف الفارابی نے رسالۂ زینون الکبیر الیونانی کے دیباچے میں عیسائی شارحین کی کتر بیونت کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے "قد شرحها النصاریٰ شرحاً ترکوا بعضها و زادوا فیها" یعنی عیسائی شارحین نے زینو کے رسایل کی شرح میں کہیں اصل متن کم کر دیا ہے بلکہ الفارابی کی طرح امام غزالی نے بھی تہافۃ الفلاسفۃ کے دیباچے کے بعد صریح الفاظ میں ارسطو کے مترجمین کی مذمت کی ہے اور بتایا ہے کہ:-

"ثم اکثر المترجمین لکلام ارسطاطالیس لم ینفکوا عن تحریف و تبدیل"[6] یعنی ارسطو کے مترجمین کے تراجم تحریف و تبدیل سے خالی نہیں ہیں لیکن چونکہ کوئی مسلمان فلسفی سریانی یا یونانی زبان سے واقف نہیں تھا لہذا مجبوراً ان سب کو بھی تراجم سے کام لینا پڑا اور مسلمان فلاسفہ بایں معنی انتخابی بن کر رہ گئے کہ انھوں نے ارسطو کے فلسفہ کے نام سے یونان کے تقریباً ہر مدرسۂ خیالی کے افکار کو اپنے نظریات میں شامل کر لیا مگر جیسا کہ بکرات و مرات اشارہ کیا جا چکا ہے تحقیق و تدقیق کے وسایل کی کمی اور سریانی اور یونانی سے ناواقفیت کی بنا پر مسلمان فلاسفہ حقیقۃً معذور تھے اور عصرِ حاضر کے ایک مشہور مورخ پروفیسر ٹلی کے الفاظ میں یہ تو صحیح ہے کہ مسلمان فلاسفہ ارسطو کی صحیح تعلیم کو دریافت نہ کر سکے لیکن جو تعلیم صدیوں سے نو افلاطونیت کے

---

[1] "بحث در آثار و افکار و احوالِ حافظ" مطبوعۂ ایران صفحہ ۴۷

[2] "حکمائے اسلام حصہ اوّل" صفحہ ۱۵۲

[3] "ترجمۂ کتاب اشارات" مطبوعۂ طہران صفحہ ط

[4] "ابن رشد و فلسفۂ ابن رشد" مصنفۂ موسیو رینال مترجمۂ مشتاق حسین خاں مطبوعۂ حیدر آباد صفحہ ۱۴۹

[5] "تہافۃ الفلاسفۃ" مطبوعۂ مصر صفحہ ۳

خس و خاشاک میں دبی چھوٹی تھی اس کا دریافت کرنا تھا بھی ناممکن[1] اور یہی وجہ تھی کہ تمام مسلمان فلاسفہ نے خالق اور معاد کے اقرار سے (جیسے امام غزالی صحیح طور پر "مطیبین اللدین لاجلہما بعث الانبیاء"[2] کے نام سے یاد کرتے ہیں) گریز کرنے میں تو یک جہتی کا ثبوت دیا لیکن الٰہیات کے مسایل میں یہ کسی اجماعی عقیدے پر متفق نہ ہو سکے بلکہ خود ایک ہی مسلمان فلسفی نے اپنے مختلف تصانیف میں الٰہیات کے متعلق متضاد نظریات کا اظہار کیا۔

مثلاً فارابی نے کبھی تو عقول فعالہ کو ان صریح الفاظ میں کثیر النوع مانا ہے "المفارقات علی مراتب مختلفۃ الحقائق الاول الوجود الذی لاسبب لہ و ہو واحد اثانی العقول الفعالۃ وہی کثیر النوع"[3] اور کبھی صاف الفاظ میں اقرار کیا ہے کہ عقل فعال ایک ہے اور اس عقل فعال میں وہ تمام اوصاف تسلیم کئے ہیں[4] جو فلاطینس کی تثلیث میں ناؤس کو حاصل تھے۔[5] کبھی خدا کو خود اپنا عاشق بتایا ہے[6] اور کبھی خدا کو ہر شے کی غایت بتا کر یہ استدلال قایم کیا ہے کہ چونکہ ہر غایت خیر ہے لہذا خدا بھی خیر مطلق ہے۔[7] کبھی خدا کو تمام موجودات کے وجود کا سبب اول ہونے کی بنا پر فلاطینس کی طرح وجود سے بھی اقدام سمجھا ہے۔[8] اور کبھی دائم الوجود تحریر کیا ہے[9]

(باقی)

---

[1] "A History of Philosophy" page 220

[2] "تہافتہ الفلاسفہ" صفحہ ۳

[3] "اثبات المفارقات" مطبوعہ حیدر آباد دکن صفحہ ۲

[4] "کتاب السیاسیات المدنیہ" مطبوعہ حیدر آباد صفحات ۸-۲

[5] "Plotinus" By Profenor Armstrong Pages 69-39

[6] "التعلقات" مطبوعہ حیدر آباد دکن صفحہ ۲

[7] حوالہ سابق صفحہ ۹

[8] "الدعاوی القلبین" مطبوعہ حیدر آباد دکن صفحہ ۳ — [9] حوالہ سابق سطر ۷

ادارۂ فروغ اُردو (نقوش) لاہور کے مطبوعات

اور اس کے خصوصی سالنامے

یدِ بیضا - سید عابد علی کے ڈنشین ڈراموں کا مجموعہ	۵ر	مولانا	۲ر
سیاست الٰہیہ - امام ابن تیمیہ کی تصنیف کا ترجمہ	۴ر	خدا نخواستہ	۲ر
ہماری داستانیں - ہماری قدیم داستانوں کی داستان	۵ر	کتبا	۲ر
نقوش لطیف - مرتبہ احمد ندیم قاسمی	۲ر	لارنس بقاعدہ	۱ر
مضامین جمال الدین افغانی	۵ر	نقبرا	۱ر
انتقاد - سید عابد علی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ	۲ر	مضامین شوکت	۱ر
تذکرۂ شعراء متغزلین - شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	۱ر	قاضی جی - تین حصے - فی حصہ	۲ر
امراؤ جان ادا	۱۰ر	دفتر و غیرہ	۲ر

افسانہ نمبر - مجلد	۱۲ر
منٹو نمبر مجلد	۶ر
مکاتیب نمبر مجلد	۱۱۲ر
طنز و مزاح نمبر	۱۰ر
طرزی نمبر مجلد	۱۲ر
شخصیات نمبر - دوم مجلد	۱۰ر
فطرس نمبر	۸ر

سرزمینِ رودکی و سعدی

(نثریہ)

(ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی)

وہ سرزمین جس سے تہذیب اور شائستگی کی اولین شعاعیں پھوٹیں، جہاں زرتشت نے محبت اور انسانیت کا درس دیا، جس کے چپہ چپہ پر دارا اور جمشید کے نقوش کندہ ہیں، جہاں فردوسی اور حافظ نے نغمہ و نور کی بارش کی، جہاں ابن سینا و فارابی نے فلسفہ و ادب کی لافانی تخلیقات پیش کیں اور جو آج بھی "امنِ وفا" اور "کشورِ گل و بلبل" ہے اور جس کو اختصار کے طور پر ایران کہتے ہیں، اُس کے صرف خیال اور تصور ہی میں میرے لئے دلکشی اور جاذبیت کا ایسا سامان پوشیدہ رہا ہے کہ اکثر میں رسمی کاموں کے ہجوم میں بھی ایک نامعلوم خوشی سے چونک پڑا ہوں۔

اگر خواب حقیقت بن جائے تو اُس خوشی کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا، ایسا ہی میرے ساتھ ہوا جب سفیرِ کبیر شاہنشاہی ایران آقائے علی اصغر حکمت کے لطف خاص سے وزارتِ فرہنگِ ایران کا میزبانی نامہ میرے پاس آیا۔ مجھے اُس کے بعد اطالیہ، فرانس جرمنی اور انگلستان بھی جانا تھا اور وہاں اپنے علمی اور تحقیقی کام کے سلسلہ میں ڈیڑھ برس رہنا تھا، لیکن ایران جانے کی ایسی خوشی تھی جیسے ایک دور افتادہ طالب علم برسوں کے بعد اپنے گھر جارہا ہو اور وہ اپنے خاص عزیزوں اور دوستوں کے ملنے کے خیال سے پھولا نہ سماتا ہو۔

اس کا سبب دراصل وہ علاقۂ محبت ہے جو ہندوستانیوں اور ایرانیوں کے درمیان سدا سے ہے۔ ہمارے اجداد ایک ہیں ہم خون و ہم نژاد۔ ہماری تاریخ کا ایک حصہ مشترک ہے، اسی وجہ سے ہمارے افکار و معتقدات، معاشرت و مذہب تہذیب و تمدن کے بھی اکثر دائرے باہم مل گئے ہیں۔

اس بات کا عین الیقین اس وقت ہوا جب میں ایران پہونچا اور وہاں دس روز وزارت فرہنگ کا مہمان رہا۔ اب ہمالیہ اور ست پڑا کے بجائے البرز اور دماوند کے پہاڑ تھے اور برگد و پیپل کے بجائے سرو و شمشاد کے پیڑ۔ طبعی ماحول فوراً بدل چکا تھا لیکن پھر بھی اس رنگا رنگ اور گوناگوں کثرت و وحدت کا ایک رشتہ موجود تھا جس کو عارفوں کے وجدان، فلسفیوں کی فکر، زاہدوں کی ریاضت اور فن کاروں کے تخیل نے قوت بہم پہونچائی تھی۔ تختِ جمشید، شوش، پازارگار، تختِ سلیمان، کاشان، نہاوند وغیرہ کے آثار اور موہن جوداڑو اور ہڑپا میں جو مماثلت ہے یا قدیم ایرانی (اوستا) اور ویدک سنسکرت میں جو مشابہت ہے وہ اتفاقی نہیں ہے اسکی پشت پر سالہا سال کا میل جول اور تہذیبی اتحاد ہے۔ اسی طرح عہدِ مغلیہ کا آرٹ، ہم اسی وقت اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، جب ایران کی خاتم کاری، آئینہ کاری، کاشی سازی، سوزن دوزی، مینا تور سازی، نقاشی۔ قالین بافی اور زری بافی ہمارے سامنے ہو۔ جس کے بے مثل اور نہایت دلکش نمونے موزۂ سلطنتی اور موزۂ باستان شناسی تہران و اصفہان میں۔ اسی طرح عہدِ اکبر جہانگیر اور شاہ جہاں کی عمارتوں کو سمجھنے کے لئے تالارِ اشرف، مسجد شاہ عباس، مسجد صدر، اور مسجد شیخ لطف اللہ کو دیکھنا چاہئے۔ کتنے رنگ اور کتنے طرز ہیں جو ہم نے لئے ہیں اور دئے ہیں۔ میں نے موزہ سلطنتی میں کئی خوبصورت اور ذی قیمت ابریشمی

قالین دیکھے۔ درخت دار یا آثار تختِ جمشید پر مشتمل۔ اُن کو دیکھ کر مجھے جے پور میوزیم کے قالین یاد آگئے۔ بالخصوص غالیچۂ بہار جہانگیر اس میں شاہ عباس کے باغ کا حسین منظر پیش کیا گیا ہے جس کے ہر سمت ناروں و سفیدار کے درخت، نہریں اور نالیاں ہیں ایران کے قدیم باغات بھی ہمارے شالامار، نشاط اور اچھابل کے باغات کی یاد دلاتے ہیں۔ یہی حال ایران کے اصلی اور ہندوستان کے مغلیہ کھانوں کا ہے۔ نام تک مشترک ہیں۔ آداب دسترخوان بھی وہی ہیں۔ اسی طرح سنائی، سعدی، حافظ، خیام ہمارے وظیفۂ زندگی ہیں اور آج بھی مجالسِ سماع میں ان ہی سے رونق ہے۔ حافظ نے جو بات اپنے زمانہ کے لئے کہی تھی اور آج بھی حقیقت ہے

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند، زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اسی طرح سے ایرانی حسن دہلوی، امیر خسرو، فیضی اور غالب کے اشعار سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میں ایران میں دس روز رہا اور ذرا اجنبیت محسوس نہ ہوئی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز جانی پہچانی ہے۔

اصفہان واقعی نصف جہان ہے۔ "شرابِ لعل و جائے امن و یارِ مہربان" سے عبارت۔ اس کا پیالۂ سنگی، مینارِ جنباں، جلفا، پل، مساجد اور دلکش عمارتیں عجیب ہیں اور جی چاہتا ہے آدمی انھیں دیکھتا ہی رہے اور وہیں عمر بسر کردے۔ ایک ارمنی تاجر تھا۔ اس کی تصویر جلفا میں ہے۔ اسے اصفہان سے بڑی محبت تھی۔ وہ جنوبی ہندوستان کے شہر مدراس میں مرا لیکن اس کا قلب اصفہان میں لاکر دفن کیا گیا، واقعی اصفہان اسی محبت کا مستحق تھا۔

تہران، اصفہان کے مقابلہ پر بالکل نیا شہر ہے۔ اس کی زیادہ تر ترقی پچھلے ۲۵ سالوں میں ہوئی ہے۔ اس میں ایک خوبصورت یونیورسٹی ہے جس کا طور و طریق فرانس کی درسگاہوں سے ملتا جلتا ہے۔ اس میں آٹھ ہزار طالب علم پڑھتے ہیں۔ پارلیمنٹ ہے۔ محلاتِ شاہی ہیں، عدالتیں ہیں، بنک ہیں، تھیٹر ہیں، سینما ہیں، قہوہ خانے ہیں، بڑے بڑے بازار، خیاباں اور ہوٹل ہیں۔ غرض کیا نہیں ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے لندن کے متعلق لکھا تھا "جو شخص دنیا سے تھک جاتا ہے وہ لندن سے بھی تھک جاتا ہے" یہی بات تہران کے متعلق ہے۔ بلکہ حافظ کی زبان میں یہ کہنا صحیح ہوگا۔

ہر گہ کہ یاد روئے تو کردم جواں شدم

عوام میں گاندھی، نہرو اور ابوالکلام کے متعلق بڑے اچھے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ایرانی عوام ماضی کی میراث سے باخبر ہیں اور نئی دنیا کے تقاضوں سے آگاہ۔ انھوں نے مادی ترقی کے ساتھ اپنی روح کی تب و تاب کا بھی سامان بہم پہونچایا ہے اور ایران کی قدیم صحت مند روایات کو سینہ سے لگا رکھا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے عوامی تھیٹر میں "سہراب اور رستم" کو دیکھ کر ہوا۔ شاہ نامہ پڑھنے کا انداز بھول نہیں سکتا۔ اب تک دل میں جوش اور سرور کی کیفیت ہے۔ یہ شعر پہلے بھی پڑھے تھے لیکن وہاں ان کی سچ مچ کی وضاحت ہوئی۔ سہراب عشق میں گرفتار ہوکر کہتا ہے ؎

غریب آہوئے آمد در کمند — کہ از بند جست و مرا کرد بند
زہی چشم بندے کہ آں پرفسوں — بہ تیغم نہ خست و مرا ریخت خوں
ندانم چہ کرد آں فسوں گر بہ من — کہ ناگہ مرا بست راہِ سخن

اس کے بعد ہومان کی یہ نصیحت کہ یہ فاتحوں اور پہلوانوں کا منصب نہیں ہے ؎

توئی مرد میداں ایں سروراں — چہ کارت بہ عشقِ پری پیکراں
تو کارے کہ داری نہ بردی بسر — چرا دست بازی بہ کار دگر
بہ نیروی مردی جہاں را بگیر — ز شاہاں بدست آر تاج و سریر

بعض مجالسِ عزاداری میں بھی شریک ہوا اور بالکل یہ معلوم ہوا کہ میں تہران میں نہیں، لکھنؤ میں ہوں۔ ان صحبتوں کا درد انگیز

کیف اب اب تک محسوس کرتا ہوں۔ میں ایران کے جس گھر میں بھی گیا اس کا بچہ بچہ آنکھیں فرشِ راہ کرنے پر آمادہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اُن کا بچھڑا ہوا عزیز آگیا۔ اُن کے تبسم میں ایسا خلوص، ایسی صداقت ایسی محبت پوشیدہ تھی کہ وہ اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور کسی طرح بھلانے کی چیز نہیں۔

علمائے تہران کے خوانِ کرم پر مجھے اچھے کھانے ہی میسر نہیں آئے جس سے کام و دہن اب تک لذت یاب ہیں بلکہ وہ غذائے روح بھی میسر آئی جس کی تلاش میں میں ایران گیا تھا۔ ڈاکٹر پور داؤد پوچھنے لگے "اب ہندوستان میں فارسی تعلیم کا شوق کس حد تک پایا جاتا ہے" میں نے عرض کیا کہ "آزادی کے بعد ایران سے روابط پھر نئے سرے سے قایم ہوئے ہیں اس لئے فارسی زبان و ادب کی طرف بھی خصوصی توجہ ہوئی ہے اور تقریباً تمام بڑی یونیورسٹیوں میں فارسی کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست ہے۔ تہذیبی رشتوں سے قطع نظر ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ اور ہند ایرانی لسانیات بغیر فارسی کی مدد کے پڑھنا ناممکن ہے"۔

ڈکٹور پور داؤد نے فرمایا کہ "ایرانیات اور ہندیات میں رشتہ قایم کیجئے اور فارسی کا مطالعہ سنسکرت کے ساتھ اور اُردو کا مطالعہ آریائی زبانوں کے ساتھ کیجئے۔ اس سے نہ صرف Indo Aryan Linguistics. کو فایدہ پہونچے گا بلکہ تہذیبی رشتے بھی مضبوط ہوں گے۔ اور فکر و نظر کی وحدت پہلے سے زیادہ استوار ہو جائے گی"۔ یہ نصیحت بڑی کارآمد ہے۔ اور میں اس کو ایران کے سفر کا رہ آورد سمجھتا ہوں۔

پسند کا معاملہ بالکل وجدانی، ذوقی اور شخصی ہے۔ اس لئے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ایرانیوں سے زیادہ مہمان نواز اور شایستہ لوگ میں نے بہت کم دیکھے ہیں، ایرانیوں کے متعلق میں نے یہ بات پہلے بھی کہی تھی اور اب پھر "ہفت شہرِ عشق" کو دیکھنے کے بعد کہتا ہوں کہ "ہزار برس کی تہذیب نے اُن کو شایستگی، مہمان نوازی اور دلداری کے اُن تمام شیوؤں سے مالا مال کر دیا ہے جو ہر اچھے تمدن کا جزو ہیں۔ آقائے تقی زادہ، دکتور محمد اقبال، آقائے وزیر فرہنگ، آقائے بدیع الزماں فروزاں فر، آقائے دکتر محمد معین، پروفیسر سعید نفیسی، دکتور پور داؤد، دکتور صفا اور دوسرے اہل علم کی عنایتوں پر غور کرتا ہوں تو میری روح "دوزانو" ہو جاتی ہے اور مجھے ادائے شکر کے لئے مناسب الفاظ نہیں ملتے۔ آخر میں یہی کہوں گا ؎

اے صبا گر بہ جوانانِ چمن باز رسی
خدمت از ما برساں سرو و گل و ریحاں را

رعایتی اعلان

من و یزداں۔ مذہبی استفسارات و جوابات۔ نگارستان۔ جمالستان۔ مکتوبات نیاز تین حصے۔ حُسن کی عیاریاں۔
۲ عہ ۱۲ ۲ ۲
فراست امید۔ مذہب۔ مجموعۂ استفسار و جواب جلد سوم۔ قول فیصل۔ شہاب کی سرگزشت۔ نقاب اُٹھ جانے کے بعد۔
۲ ۲ ۲ ۸

میزان ۔ ۴۸

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپے میں مل سکتی ہیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

آئنسٹین کے نظرئے

(ح - ا)

آئنسٹین کے نظریہ کو اصطلاحاً نظریۂ 'اضافی' کہتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسے 'نظریۂ نسبتی' کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ اُردو میں لفظ 'نسبت' زیادہ عام فہم ہے اور لفظ 'اضافی' مبہم و غیر مانوس ہے۔

نظریۂ مذکور کی اہمیت اس بنا پر ہے کہ اُس سے بعض مروجہ سائنسی اصولوں کی ترمیم و تنسیخ ہوجاتی ہے اور مکان و زمان کے تصور کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اس کو اپنا ایک خاص نظریہ وضع کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اُس کو اپنے سائنسی تجربات کے سلسلہ میں بعض ایسی مشکلات پیش آئیں جن کا حل مروجہ سائنسی نظریوں سے نہیں ہوسکتا تھا اور اس کے پیش کردہ نظرئے سے یہ مشکلات حل ہوجاتی ہیں۔

آئنسٹین نے اپنے نظرئے دو قسطوں میں شایع کئے تھے۔ پہلی قسط 'مخصوص نظریۂ نسبتی' (Special Theory of Relativity) کے عنوان سے ۱۹۰۵ء میں شایع کی اور دوسری ۱۹۱۵ء میں 'عام نظریۂ نسبتی' (General Theory of Relativity) دونوں کا موضوع ایک ہی ہے لیکن پہلی تصنیف میں موضوع محدود شکل رکھتا ہے اور دوسری تصنیف میں موضوع زیادہ وسیع ہوجاتا ہے

مخصوص نظریہ ۱۹۰۵ء

آئنسٹین کا ابتدائی موضوع "حرکت" (Motion.) ہے جس کے سلسلہ میں وقت (Time) اور "فضا" (Space.) کی بحثیں بھی سامنے آجاتی ہیں، اس لئے سب سے پہلے "حرکت" کو سمجھ لینا چاہئے:-

جب کوئی شے ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ کی طرف منتقل ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اُس نے 'حرکت' کی۔ لیکن اہل سائنس کی نظروں میں اُس کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک کو وہ 'قوتِ حرکت' (Velocity.) کہتے ہیں۔ دوسرے کو 'شرح رفتار' (Speed) ان دونوں میں فرق ہے۔ 'قوتِ حرکت' کا تعلق 'سمت' اور 'فاصلہ' سے ہے اور 'شرحِ رفتار' کا سمت و فاصلہ سے کوئی تعلق نہیں جب 'حرکت' ہمیشہ یکساں رہتی ہے تو اسے مستقل 'قوتِ حرکت' کہتے ہیں (جیسے خلا میں 'روشنی' کی 'قوتِ حرکت' جو ہمیشہ ایک سی قایم ہے) اور جب 'قوتِ حرکت' کے بدلنے کا امکان ہوتا ہے تو اُس کو 'متغیر قوتِ حرکت' کہتے ہیں۔ مثلاً گیند جب اوپر یا نیچے کی طرف پھینکی جائے تو 'قوتِ حرکت' کی تدریجی کمی بیشی کی وجہ سے شرحِ رفتار میں بھی تبدیلی واقع ہوجائے گی۔

'حرکت' سے متعلق نیوٹن کے نظرئے یہ ہیں:-

(۱) اگر کوئی خارجی قوت مخل نہ ہو تو ہر مادّی شے جو حالتِ سکون میں ہے ہمیشہ حالتِ سکون میں رہے گی اور اگر حرکت ہے تو ہمیشہ خطِ مستقیم میں متحرک رہے گی۔

(۲) کسی خارجی قوت سے کسی شے کی 'قوتِ حرکت' میں جو تیزی یا سستی پیدا ہوگی وہ خارجی قوت کے تناسب سے ہوگی اور اُس شے کی 'حرکت' کا رُخ اُدھر ہوگا جدھر خارجی قوت جارہی ہے۔

(۳) ہر عمل کا ردِّ عمل مخالف سمت میں ہوگا۔

نمبر (۱) سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ ہر مادّی جسم اگر وہ حالتِ سکون میں ہے تو ساکن ہی رہے گا اور اگر حرکت میں ہے تو خطِ مستقیم میں متحرک رہنا ہی پسند کرے گا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر چلتی ہوئی ریل گاڑی یکایک ٹھہر جائے تو اُس میں جو آدمی بیٹھا یا کھڑا ہوگا وہ جھٹکے کے ساتھ آگے کو جُھک جائے گا محض اس لئے کہ وہ آگے کی طرف چلتا رہنا چاہتا تھا۔ اسی طرح اگر کوئی ٹھہری ہوئی ٹرین یکایک چل کھڑی ہو تو اُس میں آدمی پیچھے کی طرف ڈھلک جائے گا جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حالتِ سکون میں تھا اور اُسی حالت میں اُس کا جسم رہنا چاہتا تھا۔ دوسری مثال یہ ہے کہ دوڑتے ہوئے آدمی کے لئے مشکل ہوگا کہ وہ یکلخت فوراً پیچھے کی طرف مُڑ سکے کیونکہ اُس کا جسم آگے کی طرف جانا چاہتا تھا۔

قانون نمبر ۲ کی تشریح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ اگر ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی ریل گاڑی مخالف سمت سے آنے والی گاڑی سے جس کی رفتار تیس میل فی گھنٹہ ہے ٹکر کھا جائے تو تیس میل رفتار سے چلنے والی گاڑی کے تناسب سے پیچھے کی طرف چلنے لگے گی۔ یعنی اُس سمت میں چلنے لگے گی جس سمت میں ساٹھ میل رفتار والی گاڑی جا رہی تھی۔

قانون نمبر ۳ کی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی ناؤ پر سے پانی میں جست کرے تو جست کی طاقت کے تناسب سے کشتی پیچھے کی طرف سرک جائے گی یا جب بندوق چلائی جاتی ہے تو گولی آگے جاتی ہے اور بندوق پیچھے کی طرف کاندھے کو دھکا دیتی ہے

اس سلسلہ میں آئنسٹین نے مزید انکشافات کئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے انکار ممکن نہیں کہ ایک شے کی 'قوتِ رفتار' کی تعیین مختلف موقعوں کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے یعنی اگر ایک نقطۂ نظر سے 'قوتِ رفتار' دس انچ فی سکنڈ معیّن ہوتی ہے تو دوسرے زاویۂ نگاہ سے وہ پندرہ انچ فی سکنڈ ثابت ہوتی ہے۔ اِس لئے آئنسٹین نے یہ نکالا کہ حرکت و رفتار کی تعیین صحیح معنوں میں حقیقی نہیں ہوتی، یعنی مندرجہ بالا مثال میں نہ دس انچ فی سکنڈ کی رفتار حقیقی ہے اور نہ پندرہ انچ فی سکنڈ کی۔ بلکہ یہ دونوں کسی دوسری شے کے اعتباری نسبت سے قایم کی گئی ہیں۔ اسی بنا پر 'آئنسٹین' نے اپنے نظریہ کو 'نظریۂ نسبتی' نام دیا مگر اس کا نظریہ یہ ہے کہ محض کسی ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ تک جانے کا نام حرکت رکھنا صحیح نہیں۔ حرکت کے مفہوم میں دو چیزیں اور شامل ہیں:- 'فاصلہ' اور 'وقت' اور ان سے زیادہ ہم حرکت کی تعیین نہیں کر سکتے۔

فرض کیجئے کہ ایک ریل گاڑی تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے اور اس کے ایک ڈبہ میں کوئی مسافر اُسی سمت میں جدھر گاڑی جا رہی ہے تین میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنا شروع کرتا ہے۔ اگر اس صورت مسافر کی شرح رفتار موجودہ سائنسی قاعدوں کے مطابق اس طرح معین کی جائے گی کہ ریل گاڑی اور مسافر دونوں کی رفتار کو جوڑ لیا جائے اور اس طرح مسافر کی رفتار تینتیس میل فی گھنٹہ قرار دیجائے گی، لیکن 'آئنسٹین' صحیح نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ قاعدہ ہی سرے سے قابلِ اعتبار نہیں، اس کی وضاحت وہ ریل گاڑی اور "روشنی" کی رفتار کو سامنے رکھ کر اس طرح کرتا ہے کہ بالفرض اگر 'روشنی' (کاکرنٹ جسکی مستقل رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہوتی ہے) چلتی ہوئی ریل گاڑی کے آخری ڈبہ کے برابر سے اُسی سمت کو چھوڑا جائے جس طرف ریل جا رہی ہے تو قاعدہ کے مطابق 'روشنی' کی رفتار سے ریل گاڑی کی رفتار منہا کرنے سے روشنی کی رفتار معین کیجائیگی جو ۱۸۶۰۰۰ میل سے کم ہوگی حالانکہ روشنی کی رفتار ہمیشہ ایک سی رہتی ہے۔ بہرکیف اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ 'حرکت' کی رفتار اور فاصلہ کی تعیین کے کئی پہلو ہیں۔ یعنی

(۱) ڈبہ کے اندر دوسرے مسافروں کے نزدیک مسافر مذکور کی رفتار تین میل فی گھنٹہ ہوگی اور اس نے اس قدر فاصلہ طے کیا ہوگا جو اُنھوں نے فی الوقت دیکھا تھا۔

(۲) ڈبہ کے اُس مقام کے لحاظ سے جہاں مسافر پہونچا ہے اُس کی رفتار وہی ہوگی جو ریل گاڑی کی ہے یعنی تیس میل فی گھنٹہ اور اُس نے اُتنی ہی مسافت طے کی ہوگی جتنی ریل گاڑی کے ڈبہ نے۔

(۳) اگر ریل گاڑی سے باہر پٹڑی کے کنارے کسی شخص نے مسافر کو ڈبہ کے سرے سے چلتا ہوا دیکھا ہوگا تو وہ کہے گا کہ مسافر کی شرح رفتار تینتیس میل فی گھنٹہ تھی اور اُس نے اُتنا فاصلہ طے کیا جتنا ریل گاڑی کے ڈبہ نے اور خود اُس نے ڈبہ میں چل کر کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ تینوں پیائشیں بیک وقت صحیح نہیں ہوسکتیں۔ آئنسٹین کا نتیجۂ غور یہ ہے کہ دیکھنے والے کی حالت جنبش و سکون اور وہ مقام جہاں سے دیکھا جا رہا ہے۔ نیز وہ چیز جو دیکھی جا رہی ہے اس کی حرکت یہ سب ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اس کی وضاحت وہ ایک دوسری مثال کرتا ہے جو فضائی اجسام کی حرکت سے متعلق ہے۔ وہ کہتا ہے ماہرین فلکیات اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر ظاہر کرتے ہیں کہ کسی جسم کی رفتار روشنی کی رفتار سے زیادہ نہیں اور نہ ہوسکتی ہے۔ نیز یہ کہ فضائے آسمانی میں جو کرے متحرک نظر آتے ہیں اُن کی رفتار روشنی کی رفتار کی تقریباً ($\frac{1}{10}$) دو تہائی ہے۔ لیکن اس رفتار کی تعیین ہم اپنی زمین پر سے کر رہے ہیں۔ فرض کیا جائے کہ ایک کرہ زمین کی دائیں طرف اور دوسرا کرہ بائیں طرف روشنی کی $\frac{2}{3}$ کی شرح سے زمین سے دور بھاگ رہا ہے۔ ایسی صورت میں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر ایک کرہ کے رہنے والے دوسرے کرہ کی حرکت کا حساب لگانا چاہیں تو وہ کس نتیجہ پر پہونچیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہ سائنسی قاعدے کے مطابق ایک کرہ کی شرح رفتار دوسرے کرہ کی شرح رفتار میں جو فرق ہے اور اس طرح نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ روشنی کی شرح رفتار کے مقابلہ میں $\frac{1}{10}$ ہے جو صریحاً غلط ہے، اس لئے کہ کسی متحرک شے کی رفتار اور مسافت کا سوال بہت کچھ دیکھنے والے کے سکون و حرکت اور مقام نظارہ سے تعلق رکھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں 'حرکت' اور 'فاصلہ' کی بحث کے ساتھ 'وقت' کی بحث شامل ہو جاتا بھی ناگزیر ہے اور اس باب میں آئنسٹین وقت اور واقعات و حادثات کو ایک دوسرے سے مربوط قرار دیتا ہے، یعنی وقت کی تعیین، واقعات اور مقام سے نسبت دئے بغیر ممکن نہیں۔ اس نظریہ کی تشریح میں دو مثالوں سے کام لیتا ہے۔

پہلی مثال گھڑیوں کی ہے جن سے وقت کی پیمائش کی جاتی ہے۔ آئنسٹین کہتا ہے کہ اگر دو گھڑیاں ایسی ہیں جن کی سوئیاں ایک سی چلتی ہیں اور اور ایک ہی وقت ظاہر کرتی ہیں تو اُن کی نسبت کسی واقعہ کا حوالہ دئے بغیر صرف اتنا ہی کہا جا سکے گا کہ ایک گھڑی کی سوئیاں اُس گھڑی میں اُنھیں ہندسوں پر ہیں جن پر دوسری گھڑی میں اُس گھڑی کی سوئیاں ہیں لیکن اگر یہ گھڑیاں علٰحدہ علٰحدہ کمروں میں رکھی ہوں اور بالفرض ایک کمرے میں اُس وقت کوئی واقعہ رونما ہوا جب اُس کمرے کی گھڑی دس بجا رہی ہے تو کہا جائے گا کہ دونوں واقعات 'بیک وقت' رونما ہوئے اور اس طرح 'وقت' واقعہ سے مربوط ہو جائے گا۔[1]

دوسری مثال ریل کی پٹڑی اور ریل گاڑی کی ہے (یاد رہے کہ ریل گاڑی۔ ریل کی پٹڑی اور پٹڑی کے ادھر اُدھر کی زمین ظرف مکانی ہیں) آپ ایک حادثہ کی اطلاع آئنسٹین کو ان الفاظ میں دیتے ہیں کہ پٹڑی کے دونوں سروں پر 'بیک وقت' بجلیاں گریں۔ آئنسٹین آپ سے یہ سوال کرتا ہے کہ 'بیک وقت' سے آپ کی کیا مراد ہے۔ آپ طرح طرح سے تشریح و توضیح کرتے ہیں۔ مگر

---

[1] 'واقعہ' کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی ظرف مکانی میں رونما ہو، ہم نے ظرف مکانی کا جملہ استعمال کیا ہے ورنہ آئنسٹین نے وہ جملہ استعمال کیا ہے جسے انگریزی میں (Co— ordinate System) کہتے ہیں۔ علوم ریاضی کے مطابق کائنات میں تین سمتیں قرار دی گئی ہیں، جن کو ہم اپنی سادہ زبان میں طول و عرض عمق کہتے ہیں اور اصطلاحی زبان میں ابعاد ثلثہ۔ انگریزی زبان میں اُن کو مجموعی طور پر (Co-ordinates.) کہا جاتا ہے پس 'کو آرڈی نیٹ سسٹم' کے معنی ہوئے وہ شے جو صفات متذکرہ سے متصف ہو۔ چونکہ یہ تینوں باتیں 'ظرف مکانی' کے مفہوم میں شامل ہیں اس لئے اس مضمون میں 'ظرف مکانی' کا مختصر کلمہ استعمال کیا گیا ہے۔

آئنسٹین مطمئن نہیں ہوتا۔ بالآخر کسی نتیجہ پر پہونچنے کے لئے 'بیک وقتی' کا مفہوم سمجھنے کی صورت ہوسکتی ہے کہ پٹڑی کی لمبائی میں بیچوں بیچ کوئی ایسا نقطہ متعین کیا جائے جہاں کوئی شخص دونوں سروں کی بجلیوں کی چمک کو ایک ساتھ دیکھ سکتا ہے۔ اس مرحلہ پر پہونچ کر آئنسٹین فرض کرتا ہے کہ بجلی گرنے سے پیشتر ایک ریل گاڑی جس میں دو مسافر بھی ہیں پٹڑی کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ اور جس لمحہ میں ریل گاڑی پٹڑی کے بیچوں بیچ مقام پر پہونچتی ہے اُسی لمحہ دونوں سروں پر بجلیاں گرتی ہیں، لیکن ایک مسافر بھی بیچوں بیچ مقام پر بیٹھا تھا اور دوسرا آگے کی طرف چل رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں بیٹھے ہوئے شخص کو بیک لمحہ دونوں کی روشنی نظر آئے گی لیکن جو شخص چل رہا ہے اُس نے کچھ نہ کچھ مسافت طے کرنی ہوگی اس لئے فاصلہ طے شدہ کے لحاظ سے ایک سرے کی بجلی کی روشنی اُس کی نظر تک جلد پہونچ جائے گی اور دوسرے سرے کی چمک اُس کو کسی قدر بعد میں محسوس ہوگی کیونکہ ایک طرف کی روشنی کو زیادہ۔ خلاصہ یہ کہ بیٹھے ہوئے شخص کے نزدیک بجلیاں بیک وقت گریں اور چلنے والے کی نظر میں یکے بعد دیگرے۔ ان حالات کے پیش نظر آئنسٹین اس نتیجہ پر پہونچا کہ وقت کی تعیین بھی دیکھنے والے کی حالتِ سکون و جنبش سے اور اُس مقام سے نسبت رکھتی ہے جہاں سے اُس کی تعیین کی جائے۔ اس مثال میں آئنسٹین نے صرف ایک مثال سے کام لیا ہے جس کو اُس نے ایک مرتبہ بجلی گرنے کے وقت استادہ بیان کیا ہے اور دوسری مرتبہ متحرک۔ سادہ طریق پر یوں بھی نقشہ کھینچا جاسکتا ہے کہ ریل کی پٹڑی کے درمیانی مقام پر ایک شخص (الف) موجود ہے اور دوسرا شخص (ب) اُس سے آگے دوسرے سرے کے قریب ہے۔ جب دونوں سروں پر 'بیک وقت' بجلی گری تو 'الف' کو بیک وقت دونوں طرف کی روشنی محسوس ہوگی لیکن 'ب' کو ایک سرے کی روشنی فاصلہ زیادہ ہونے سے دیر میں نظر آئے گی اور دوسرے کی روشنی فاصلہ کم ہونے سے جلد تر محسوس ہوگی۔ وہ یہ نہیں کہہ سکے گا کہ دونوں سروں پر بجلیاں بیک وقت گریں۔

یہ تھا خلاصہ آئنسٹین کے ۱۹۰۵ء کے نظریات کا جن کے مطابق 'حرکت'۔ 'فاصلہ' اور 'وقت' کی تعیین کو اس نے محض نسبتی قرار دیا۔ یہ نظرئے 'نیوٹن' کے اس نظریہ کے مطابق ہیں کہ 'حرکت' خطِ مستقیم میں جاری رہتی ہے بشرطیکہ کوئی دوسری شے مخل یا حایل نہ ہو' نیز یہ کہ خطِ مستقیم دو نقطوں کے درمیان مختصر فاصلہ ہوتا ہے اسی نظریۂ نسبتی کو ۱۹۱۵ء میں آئنسٹین نے "عام نظریۂ نسبتی" (General Theory of Relativity.) کے نام سے موسوم کیا اور اس پر اپنا نظریۂ کائنات قایم کیا۔ اس عام نظریہ کی وضاحت میں 'حرکت' اور 'وقت' کے علاوہ اور بہت سے مسایل، مثلاً "فضا" (Space.) "قوتِ فعالی" (طاقت۔ Energy.) کششِ ثقل (Gravitation.) وغیرہ بھی زیرِ بحث آجاتے ہیں جن کی توضیح ضروری ہے۔

(باقی)

عہدِ حاضر کی ایک بے مثل کتاب

"مذاہبِ عالم" تمام دُنیا کے مذاہب کی آبادی، رقبۂ حکومت اور ان کی موجودہ سیاسی و ثقافتی موقف پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کے متعلق خصوصیت کے ساتھ بڑی صراحت و تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے کہ:۔

(۱) ان کی آبادی کتنی اور کہاں کہاں ہے۔ (۲) ان کی حکومتوں کے حدود کیا ہیں۔ (۳) ان کی سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی اہمیت کیا ہے۔ (۴) کن کن ملکوں سے ان کے سیاسی و تجارتی تعلقات کیا ہیں۔ استعماری حکومتوں کے عروج و زوال کی بھی پوری تاریخ دیدی گئی ہے اور جدید سیاسی معاہدات کی تفصیل بھی۔ آٹھ رنگین سادہ نقشے بھی شامل ہیں۔

قیمت مع محصول ڈاک چودہ روپیہ پیشگی۔

مینیجر نگار۔ لکھنؤ

آزادی کے بعد اُردو شاعری

(پروفیسر ابو محمد سحر فتحپوری)

جس طرح آزادی کی پہلی لڑائی کے بعد اُردو شاعری میں ایک نئی تحریک کی ابتدا ہوئی تھی اسی طرح حصولِ آزادی کے بعد اُردو شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس نئے دور کا کوئی واضح اندازہ ممکن ہے اس وقت عام طور پر آسانی سے نہ لگایا جاسکے لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مستقبل کا ادبی مورخ جب اُردو شاعری کی تاریخ مرتب کرے گا تو اسے آزادی کے بعد کی اُردو شاعری کے لئے ایک نیا دور قایم کرنا پڑے گا۔ یونتو دس سال کا زمانہ ہی کیا لیکن جب میرے ذہن میں جوشؔ ملیح آبادی کا یہ شعر آتا ہے کہ:-

سنواے بستگانِ زلفِ گیتی ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

تو اس تھوڑی سی مدت کی اہمیت قرنوں سے زیادہ ہوجاتی ہے۔ اس مدت میں اُردو میں جو شعری ادب معرضِ وجود میں آیا ہے اس کا حجم بہت کافی ہے۔ یہاں بمشکل اس کے چند نمایاں پہلو پیش کئے جاسکتے ہیں۔

آزادی کے بعد کی نظموں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں کچھ مستقل موضوعات ملتے ہیں ان میں سب سے پہلا موضوع خود آزادی ہے۔ جب غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں تو انقلاب کے مغنیوں نے سب سے پہلے آزادی ہی پر قلم اُٹھایا۔ غالباً یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ صبح آزادی کی تابناکی کو فرقہ وارانہ فسادات کی سیاہی نے سنولا دیا تھا۔ پھر آزادی کوئی جادو تو تھی نہیں کہ آتے ہی ملک کی تمام خرابیوں کو دور کردیتی۔ اُردو کے بعض شعراء ملک کے حالات سے دل گرفتہ ہوگئے اور انھوں نے آزادی کو تاریکی اور فریب سے تعبیر کیا۔ لیکن آزادی کے زیادہ باشعور متوالوں نے محسوس کیا کہ اس میں آزادی کا کوئی قصور نہیں چنانچہ انھوں نے جہاں انسانیت سوز مظالم اور افلاس و ناداری کے خلاف آواز اُٹھائی وہاں آزادی کا پورا گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم بھی کیا۔ ان شعراء میں جوشؔ، مجازؔ اور آنند نرائن ملاؔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

آزادی کے حصول نے ہندوستان کو قومی خوشی کے دو دن دئے ہیں۔ ایک یوم آزادی اور دوسرا یوم جمہوریت۔ آزادی کے بعد ہر سال ان موقعوں پر اُردو کے ممتاز شعراء نے مختلف زاویوں سے نظمیں لکھیں جن میں آزادی اور جمہوریت کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا اور قومی ترقی کا جایزہ لیا گیا۔ ان نظموں کا سلسلہ جوشؔ کی نظم "جشنِ استقلال" سے شروع ہوکر جگن ناتھ آزادؔ کی نظم "آزادی کے دس سال" پر ختم ہوتا ہے۔

جیسا کہ اشارہ کیا گیا تقسیم کے ساتھ ہندوستان اپنی تاریخ کے ایک ہولناک دور سے گزرا۔ انگریز جس طرح آئے تھے اسی طرح رخصت ہوئے۔ احمد ندیم قاسمی کے الفاظ میں:-

اُن کا آنا حشر سے کچھ کم نہ تھا
اور جب پلٹے قیامت ڈھا گئے

اُردو شعرا نے ان خونی واقعات پر نظمیں پیش کر کے انسان دوستی کا ثبوت دیا اور تعصب اور تشدد کے خلاف ملک میں ایک عام فضا پیدا کر دی میں نے دوسرے عناصر کے ساتھ مل کر امن و امان کی بحالی میں بڑی مدد کی۔ لیکن بہیمیت اور درندگی کے عفریت نے صلح و آشتی کی طاقتوں سے ہار جانے کے بعد ایک دوسرا روپ دھارا۔ کھلے بندوں آنے میں اسے شکست فاش ہو چکی تھی۔ اب کے اس نے چوری کا راستہ اپنایا اور ہندوستان کے بسم پہ وار نے کے بجائے اس کی روح پر حملہ کیا جس نے مہاتما گاندھی کی شہادت کی دردناک صورت اختیار کی اس وقت ہندوستان بلکہ ساری دُنیا میں آوازۂ ماتم بلند تھا اُردو شعرا خصوصاً جگر، جوش، روش، مجاز، وامق، نشور واحدی اور ملا وغیرہ نے درد انگیز نظمیں لکھیں اور مہاتما گاندھی کی شہادت اُردو نظم کا ایک مستقل موضوع بن گئی۔ جوش کی نظم "السلام" کا ایک بند ملاحظہ ہو:-

تو امنِ مرحمت آئینۂ ایثار تھا — صحتِ افکار انساں کے لئے بیمار تھا
برہمن کا چارہ فرما شیخ کا غمخوار تھا — تو رواداری کا دیوتا امن کا اوتار تھا
السلام اے کعبہ و کاشی کے دربان السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیدانِ السلام

اُردو شاعری کو بین الاقوامیت سے سب سے پہلے اقبال نے روشناس کیا تھا۔ ان کے بعد اُردو شعرا بین الاقوامی مسایل سے وقتاً فوقتاً متاثر ہوتے رہے۔ لیکن حصولِ آزادی کے بعد اس رجحان نے بڑی حد تک ایک تحریک کی حیثیت حاصل کر لی۔ یہ براہ راست اس بین الاقوامی شعور کا نتیجہ تھا جو آزادی کے بعد ملک میں پیدا ہوا۔ امن کی حمایت اور ایشیائی ممالک کی بیداری اور اس کے مختلف پہلوؤں پر پرجوش نظموں کی ایک اچھی خاصی تعداد اور دوسرے ملکوں کے انقلابی شاعروں کی نظموں کے ترجمے اُس روش کے آئینہ دار ہیں۔

ان موضوعات کے علاوہ قومی اور سماجی زندگی کے دوسرے پہلو جو آزادی سے پہلے کی نظموں پر چھائے ہوئے تھے اس دور میں بھی حاوی ہیں۔ اگر مثالیں دینے کی ضرورت ہو تو مختلف رجحانات کو ایک سلسلہ میں مربوط کر کے جوش کی "بہار پھر بہار ہے" اور "رشوت" فیض کی "صبح آزادی" اور "نثار میں تری گلیوں پہ" سردار جعفری کی "پتھر کی دیوار" اور "امن کا ستارہ" ساحر لدھیانوی کی "آہنگ انقلاب" اور "پرچھائیاں" اور وامق کی "تقسیم پنجاب" پچھلے دس سال کی اہم نظموں میں شمار کیجا سکتی ہیں۔ آزادی کے بعد کی نظموں میں قومی اور بین الاقوامی مسایل کا پلہ بھاری ہے لیکن حسن و عشق اور ذاتی دکھ درد کی داستانیں بھی بڑے مؤثر انداز میں چھیڑی گئی ہیں۔ جوش کی نظم "قیدیوں کا حملہ" فیض کی نظم "تمھارے حسن کے نام" اور جاں نثار اختر کی نظموں "مراحل" اور "خاک دل" اس کی مثال ہیں۔ اس قسم کی اکثر نظموں میں خاص بات یہ ہے کہ سماج سے اپنے رشتہ کو استوار رکھا ہے جس کی وجہ سے اس کے ذاتی واردات پر بھی اس کے ماحول کی گہری چھاپ ہے۔ بعض نظموں میں مناظر فطرت کو بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ جگہ دی گئی ہے۔ جوش کی نظم "سحر جگمگائی" کے علاوہ کشمیر پر روش، سردار جعفری، وامق اور تاباں کی نظمیں جدید شاعری اس گزرے ہوئے رجحان کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ (شہری) زندگی کے کچھ نئے پہلو بھی نظموں میں اُبھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جیسا کہ اختر انصاری کی نظم "تمامنگیشکر" اور آل احمد سرور کی نظم "کافی ہاؤس" سے ظاہر ہے۔

اس زمانہ میں اگرچہ زیادہ تر پابند نظمیں ہی لکھی گئیں لیکن ناانصافی ہوگی اگر یہ نہ کہا جائے کہ آزاد نظم کو پہلے سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی جس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اسے تحت الشعور اور لاشعور کے الجھیڑوں سے نکال کر عام دلچسپی کے مضامین کے لئے کسی قدر سلیقہ سے استعمال کیا گیا۔ نظم کے علاوہ غزل، رباعی اور قطعہ کی طرف بھی ہمارے شعرا کی خاص توجہ رہی۔

اگرچہ اُردو شاعری کا موجودہ دور نظم نگاری کا دور ہے لیکن آزادی کے بعد کا زمانہ غزل گوئی کے اعتبار کے لئے بھی اہمیت رکھتا ہے

اور کچھ عجب نہیں کہ یہ براہ راست اس انتشار اور ہیجان کا اثر ہو جو تقسیم کی وجہ سے سماجی زندگی میں راہ پا گیا تھا۔ غزل کا احیا یوں تو میر و غالب کی تقلید ہیئت پرستی اور شبابیات پر زور کی شکل میں نمودار ہوا لیکن غزل کو تازہ دم کرنے میں سب سے زیادہ جس چیز نے مدد کی وہ عشقیہ مضامین کے ساتھ زندگی کے نئے مسایل کی آمیزش تھی۔ یہ آمیزش شعور اور حسن کی ایک ایسی سطح پر کی گئی جسنے غزل کو گہرائی اور گیرائی دونوں عطا کی۔ نظم گو شاعر کی طرح آج کے غزل گو شاعر نے بھی اپنے آپ کو سماج اور کائنات سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔ وہ ثنویت کی اس منزل سے گزر چکا ہے جس میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی تقسیم کا مسئلہ درپیش تھا۔ یونتو غزل ایک روایتی صنف ہے اور غزل گو کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ نئے تجربات کے ساتھ روایت سے اپنے رشتے کو مضبوط رکھے لیکن اب غزل کے اچھے اشعار میں خواہ وہ عاشقانہ ہوں یا غیر عاشقانہ عموماً خارجی زندگی کا ایک صحت مند اور شعوری عکس ضرور دکھائی دیتا ہے، جذباتی خلوص اور فنی پختگی کے ساتھ یہی وہ توانا عنصر ہے جس کی وجہ سے نظم کی طرح غزل بھی زندگی کے اظہار کا ایک کامیاب ذریعہ بنی ہوئی ہے اور بنی رہے گی۔ غزل کی تاریخ بتاتی ہے کہ روایت کے حصار میں اس کا ایک انقلابی کردار ہے۔ وہ صرف دل کی دھڑکن کا ساتھ نہیں دیتی بلکہ زمانہ کی نبض کو بھی پہچانتی ہے اور ایسا ہوتا ہے کہ ان دونوں میں ہم آہنگی اس کی عظمت کی ضامن بن جاتی ہے۔ آزادی کے بعد متعدد نئے اور پرانے شعراء کے کلام میں غزل اپنے اس روپ میں جلوہ گر ہوئی۔ چند شعر اس کی وضاحت کے لئے کافی ہوں گے:۔

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے	گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے	جگر
ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں	میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے	〃
اس دور میں زندگی بشر کی،	بیمار کی رات ہو گئی ہے	فراق
فرصتِ غم کہاں زمانے میں	آج رو لیں ترے لئے دم بھر	〃
کہیں وہی نہ ہوں اہلِ جہاں کی تقدیریں	ہمارے دل سے جو پرچھائیاں گزرتی ہیں	〃
بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا	تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے	مجاز
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں	وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے	فیض
گلوئے عشق کو دار و رسن پہونچ نہ سکے	تو لوٹ آئے ترے سر بلند کیا کرتے	〃
حادثے اور بھی گزرے غمِ الفت کے سوا	ہاں مجھے دیکھ مجھے تو مری تصویر نہ دیکھ	مجروح

آزادی کے بعد جن شعراء کی نظموں اور غزلوں میں تازگی اور توانائی دکھائی دیتی ہے ان کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ جن شعراء کا ذکر چند مخصوص میلانات کے تحت میں آگیا ہے، ان کے علاوہ کیفی، جذبی، مخدوم، اختر الایمان، سلام، نیاز حیدر، خلیل الرحمٰن، عرش، ثانی، نریش کمار شاد، عدم، قتیل شفائی اور ناصر کاظمی وغیرہ بھی اہمیت کے مالک ہیں۔ آزادی کے بعد کئی سال تک اُردو شاعری میں آزادی کے پہلے کی طرح نعرہ بازی کا غلبہ رہا لیکن اس کی لے اب مدھم ہو گئی ہے۔ یہ ایک نیک فال ہے۔ مجموعی حیثیت سے اُردو شاعری کی فضاء خدا ن دوستی، آزادی اور زندگی کے نغموں سے معمور ہے جس کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل نہیں ہے کہ فکر و فن کی مزید پختگی کے ساتھ اُردو شعراء اپنے کلام میں روحِ وطن اور روحِ عصر کو زیادہ کامیابی کے ساتھ سمیٹ سکیں گے اور اگر یہ خیال درست ہے کہ:۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی (اقبال)

تو اس دور میں جس کی ابتدا آزادی کے حصول سے ہوئی ہے آگے چل کر عظیم تر شاعری کی تخلیق ہو سکے گی۔

مولانا آزاد ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے

(پروفیسر رفیع الدین عنایتی)

آیئے اس کائنات کی پرانی کتاب کے اوراق کو پلٹیں جس کا پہلا اور آخری صفحہ گم ہوگیا ہے اور جن کی دریافت میں نوع انسانی مصروف ہے - اس میں کیا نظر آئے گا ؟ انبیاء اور پیغمبر ابدی سچائیوں کے صحیفوں کو انسانوں کو سمجھاتے ہوئے ملیں گے - ائمہ، مجتہدین فلسفی، سائنسداں اور مصلحین دکھائی پڑیں گے جو لوگوں کو رموز حیات کی تعلیم دیتے ہوں گے - ان سب نے کس مدرسہ، کس مکتب، اور کس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی ؟ ان کی تعلیم گاہ خداہ کی یہ سرزمین تھی جو اس کی ربوبیت کا مظہر ہے - اس آسمان کے نیچے جو انگنت مادی آفتاب و ماہتاب سے منور ہے، ان پہاڑوں کی گھاٹیوں میں جو خالق کائنات کی عظمت و جلال کو ظاہر کرتی ہیں، ان دریاؤں کے کنارے جو خدا کی زمین کو سیراب کرتے ہیں، جہاں سے شاندار اور خوبصورت محلات ابھرے ہیں، انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی - وہ سچائی کے علمبردار تھے - وہ حقایق کے منکشف کرنے والے تھے - وہ انسانوں کی توجہ خدا اور اس کی کائنات کی طرف مایل میں مصروف تھے - وہ باغی تھے وہ تکالیف کے پہاڑوں کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے - انھوں نے یہ سب برداشت کیا لیکن صداقت، یقین، صبر اور استقامت کا دامن کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا -

مولانا کا شمار بھی بڑے مصلحین میں ہوتا ہے - وہ اس صدی کے ہندوستان کے سب سے بڑے انسان تھے - آج کوئی کم نظر کسی بھی تعصب کی وجہ سے ان کی عظمت کو جھٹلائے، لیکن ان کی شخصیت کا چہرہ تابناک بدستور روشن رہے گا - اس کو تاریخ نے اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے - جس شخصیت نے چالیس کرور انسانوں کو نصف صدی تک سچائی، حق پرستی، استقامت، انسانی مساوات انسان دوستی اور آزادی و حریت کا سبق دیا اس کے کارنامے کیسے فراموش کئے جا سکتے ہیں - بظاہر تو ان کا لباس، ان کی گفتگو، ان کی طرز معاشرت ایک عالم کی طرح تھی - لیکن وہ عام علماء سے بالکل مختلف تھی - وہ "خالص انسان" تھے - انھوں نے انسانوں کو بغیر کسی قسم کی تفریق کے محض انسان تصور کیا - ان کو آزادی دلانے میں اپنی عمر بسر کی ان کو سماجی، سیاسی، اور فکری تعلیم دیتے رہے - اس لئے کہ وہ سماجی مصلح تھے - اس کے معلم تھے - اس صدی میں اگر کسی کا ان سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے تو چیرمین ماؤ ہے - ہمارے ملک کی جتنی بھی بڑی شخصیتیں ہیں ان کا نمبر مولانا کے بعد ہے - اس کا فیصلہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے ہندوستان کو آزادی دلانے میں - اور انھوں نے اس امر کا اقرار بھی وقتاً فوقتاً کیا ہے، اس بات کے تسلیم کرنے میں کسی مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے کام لینے کی ضرورت نہیں - ہم سب اس صدی کے انسان ہیں جبکہ علم کی ترقی اور کائنات کی دریافت نے انسانوں کے دماغ روشن کر دئے ہیں -

مولانا نے ۷۱ برس کی عمر سے مرتے دم تک ہندوستانی سماج میں اصلاح کا کام کیا - انھوں نے سامراجیت اور سرمایہ داری کی لعنت سے نجات دلانے میں ملک کی خدمت کی، اس ملک کے باشندوں کو آزادی، حریت، مساوات اور جمہوریت کی نعمتوں سے مالا مال کرنے کی کوشش کی، مذہب کو تنگ نظری اور تعصب سے پاک کرنے میں حصہ لیا - سماج کی تنگ و تاریک کٹھیاؤں کو اجاگر کیا - لوگوں کی فکر کو دور اندیشی، بصیرت اور وسیع النظری کی قندیلوں سے روشن کیا، کامیاب اور سرفراز زندگی بسر

کرنے کے رموز سکھائے۔ اعلیٰ کردار پیدا کرنے کی تعلیم دی۔ ایسے کردار جن کو آسمان کی ساری بجلیاں بھی خاکستر نہیں کر سکتی ہیں۔ ایسے کردار جن کو سخت سے سخت طوفان بھی متزلزل نہیں کر سکتی ہیں۔ آزادی کے بعد کے تعلیمی خطبات ان کے تعلیمی پیغام کی پوری روح اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ تب ہی سمجھ میں آسکتے ہیں جب ہم ان کی تحریروں سے ان کا رشتہ جوڑیں اور اس ماحول کو بھی نظر میں رکھیں جس میں رہ کر انھوں نے کام کیا۔ لیکن یہ سب کچھ کون کرے۔ لکھنے والے لکھتے ہیں لیکن بیکار۔ وہ پورا پڑھتے نہیں۔ وہ ان کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ دوسری طرف بیشتر لکھنے والوں میں وہ بصیرت اور علم نہیں جس کے بغیر مولانا کو سمجھنا دشوار ہے۔

آزادی کے بعد کے تعلیمی خطبات ان کے الٹ جایئے۔ اس میں ہم کو ایک ہی بات ملے گی اور وہ "انسان" کی تخلیق اور اس کی تربیت ہے۔ وہ انسان ہندو نہیں ہے اور عام اصطلاح میں مسلمان نہیں ہے۔ بلکہ خالص انسان ہے، جو اس سرزمین کی ساری دولت کا وارث ہے۔ وہ تعصب، تنگ نظری، تفریق رنگ و نسل کی لعنتوں سے آزاد ہے۔ جس کی شخصیت صداقت حق پرستی، صبر و استقامت اور انسانی مساوات سے آراستہ ہے، مولانا کے نزدیک تعلیم کو چاہئے کہ انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرے، اس کی سوئی ہوئی خوبیوں کو اُجاگر کرے، اس کی اصلاح اور تربیت کا کام انجام دے، اس کے بچپن، جوانی ہر منزل کو ارتقائی سانچوں میں ڈھالے، لوگ اپنی تاریخ، اپنی تہذیب و تمدن کے مظہر ہوں۔ وہ جس ماحول میں سانس لیتے ہیں اسکے مطابق ہوں۔ ان کا ظاہری و باطنی روپ اپنے زمانہ میں رہتے ہوئے اپنی تاریخی اقدار کی نمایندگی کرتا ہو۔ ان کا تعلیمی مشن یہی تھا کہ ہندوستانی اپنی مشترکہ تہذیب کی ساری نعمتوں کو اپنی شخصیت کے دامن میں سمیٹ لیں، وہ ہندوستان جو علوم و فنون کا گہوارہ رہ چکا ہے، جہاں فلسفہ اور دوسرے علوم جب اپنے معراج کمال کو پہونچ چکے تھے تو دوسرے ممالک میں ان کی ابتدا ہوئی یہ محض غلو نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے جو سب پر عیاں ہے۔

تعلیم کا کام ان کے نزدیک انفرادی اور سماجی شخصیت کی اصلاح کا کام ہے، وہ لوگوں کو سرمایہ داری، سامراجیت اور تباہکاریوں سے نجات پانے کی ترغیب دیتی ہے اور ان کو ایک متحدہ سماج کی لڑیوں میں پرو کر کام کرنے کا سبق دیتی ہے۔ ہر فرد ایک شخصیت ہو، لیکن وہ سماجی شخصیت کا ایک متحرک اور جاندار پرزہ بھی ہو، وہ مہذب ہو، متمدن ہو۔ صحیح طور پر تعلیم یافتہ ہو، اس کا لباس، غرض اس کی ساری معاشرت تہذیب کی آنچ میں تپی ہو، وہ اس سرزمین پر خدا کا شاہکار ہو، وہ آزادی، انسان دوستی اور رواداری کا چلتا پھرتا نمونہ ہو۔ یہ تعلیم کا مقصد ہے، ہندوستان کی مٹی کا خمیر رواداری اور انسان دوستی سے اُٹھا ہے اس لئے کہ یہاں انسانی نسلوں کے کتنے ہی قافلے آئے، اور یہیں رہ بسے، اس کو اپنی فکر کی دولت سے مالا مال کیا۔ انھوں نے اس کو علم، تہذیب اور تمدن کی دولت دی۔ مولانا کے نزدیک سچی اور حقیقی تعلیم کا نصب العین یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے اشتراک سے کام لیتے ہوں۔ ان کے نزدیک رنگ و نسل اور مذہب و ملت کی مصنوعی تفریق نہ ہو۔

مولانا کے نزدیک اصل تعلیم سماجی تعلیم ہے۔ ہندوستان کے عوام دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ میں ان پڑھ اور غیر متمدن ہیں۔ ان کے چہرے غربت و افلاس کی گرد و غبار سے اٹے ہوئے ہیں، وہ اپنے ملک کی دولت اور اس کی نعمتوں سے فایدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ ان کے دماغ علم و بصیرت سے منور نہیں ہیں، ان کو زمانہ کی رفتار ترقی کے قدم بہ قدم چلنا نہیں آتا، وہ سائنس کے آلات کو استعمال میں نہیں لاسکتے۔ وہ زندگی کے حقایق کو سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتے، ان کے کان وقت کی آواز نہیں سن سکتے۔ تو تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ ہندوستانیوں کی فکری سطح کو اونچا کرے، تاکہ وہ ہندوستان کو بام ترقی پر پہونچا سکیں، اور اشتراکی طرز زندگی کو جو ان کا منتہا ہے پورے طور پر حاصل کر سکیں۔ وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے علمی، تہذیبی اور تمدنی سرمایہ میں اضافہ کر سکیں، وہ مشرق و مغرب کی فکر کو اپنے میں اس طرح سمو لیں کہ ان کا ملک مشرق و مغرب کا سنگم بن جائے۔ سائنس کی

ترقیات کے ساتھ ہی ساتھ روحانیات کا لازوال سرمایہ بھی ان کی سماجی شخصیت میں محفوظ ہوجائے اور مشرق و مغرب کی تفریق مٹ جائے ہندوستان موسیقی اور آرٹ کا مرکز رہا ہے۔ موجودہ آرٹ کے ذریعہ لوگوں کو ان ساری چیزوں کی آوازیں سنائی جائیں تاکہ ان میں قدیمی روح جاگ جائے۔ ان کے قلب میں ماضی کے نغمے بیدار ہوجائیں۔ انسان کا دماغ سوچنے کے لئے ہے، اس کے کان سننے کیلئے ہیں، اس کی زبان گفتگو کرنے کے لئے ہے۔ اس کے ہاتھ کام کرنے اور تعمیر کے لئے ہیں۔ شخصیت ان ساری چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے، اس لئے بہتر تعلیم وہی ہے جو کانوں کو نغموں اور صداؤں سے ہمکنار کرتی ہو۔ وہ لوگوں کے دماغ کو سوچنے کی ترغیب دلاتی ہو۔ ان کی زبان کو گویائی کا فن سکھاتی ہو، اور ہاتھوں کو تعمیر کے رموز سکھاتی ہو۔ ان کے جسم کو رقص کرنے پر اکساتی ہو، تاکہ ان کی شخصیت زمانہ کے اسٹیج پر ایک کردار کا مرتبہ حاصل کرلے۔ اس لئے موسیقی، رقص، شاعری، ڈرامہ وغیرہ سب ہی تعلیم کے دائرہ میں آجاتے ہیں۔ ہندوستان کی ہواؤں میں موسیقی ہے، اس کے آب و گل سے نغمے ٹپکتے ہیں۔ تو تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں میں اس قسم کی روح بیدار کرے۔ لوگوں میں زراعت کے آلات کو بھی موسیقی کے آلات کی طرح استعمال کرنے کا شوق و جذبہ پیدا کرے تاکہ وہ زندگی کو ایک مقصد سمجھ کر گزاریں۔ اس میں کیف اور آسودگی پائیں۔ اس کے بسر کرنے میں ایک لذت محسوس کریں۔ مولانا کے نزدیک تعلیم کا یہی مقصد ہے۔ وہ ہر مصلح کی طرح تعلیمی اصلاح پر زور دیتے ہیں۔ وہ عوام کے معلم ہیں۔ انھیں میں رہکر انھوں نے ان کو غلامی سے نجات دلائی ہے۔ وہ ایک مقصد کے لئے زندہ رہے اور اسی کی خاطر راہی ملکِ عدم ہوئے۔ یہ ضرور ہے کہ سماجی اصلاح کا کام ایسا نہیں ہے جو ایک دو دن کا ہو، اس کی کوئی انتہا نہیں۔ جب تک دنیا باقی ہے یہ کام بھی جاری رہے گا۔ نہ معلوم اس ایک مقصد کی لگن میں کتنے ابوالکلام پیدا ہوں گے اور اس دنیا سے گزر جائیں گے۔ لوگوں کو چاہئے کہ وہ کالیداس، تلسی، کبیر، جائسی، عبدالرحیم خان خاناں، امیر خسرو، انیس اور غالب کی چیزوں کو اپنا قومی سرمایہ سمجھتے ہوئے ان کو محفوظ کریں۔ وہ سری کرشن کی روح موسیقی کو اپنائیں اور ان انگنت لوگوں کی چیزوں کو جو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں مرے محفوظ کریں۔ اور اس طرح اپنی شخصیت کے ہر حواس کی تربیت کریں، اس کو تعلیم دیں۔ ہندوستان کے فلسفیوں، مورخوں، رشیوں اور دوسرے باکمالوں کی خوبیوں کو اپنے میں اجاگر کریں۔ ان کی روحانیت کو اپنے اندر پیدا کریں۔ ان کی فلسفیانہ فکر کو اپنی شخصیت کا جزو بنائیں ان کے تجربات سے فایدہ اٹھائیں اور اپنی شخصیت میں ہندوستان کے صدیوں کے کارناموں کو اس طرح سمولیں کہ اس کے صحیح وارث کہلانے کے مستحق بن جائیں۔

مولانا نے ساری زندگی ایک انقلابی کی حیثیت سے بسر کی۔ انھوں نے ہندوستانی سماج کے قلب میں انقلاب کے شعلے بھڑکائے سامراجیت اور سرمایہ داری کی لعنت سے اس ملک کو نجات دلائی، وہ شروع ہی سے ایسی حکومت کا خواب دیکھ رہے تھے جو لوگوں کے اشتراک سے قایم ہو، جو لوگوں کی ہو اور لوگوں کے لئے ہو۔ جس کے ذریعہ وہ اپنے ملک کی سماج کو ترقی دے سکیں، ان کا خواب پورا ہوا اور آزادی ملنے کے دس سال تک وہ ایک وزیر تعلیم کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اہم ملکی اور بین الاقوامی گتھیوں کو سلجھانے میں دوسروں کے مشیر کار رہے، ہندوستان نے آزادی ملنے کے بعد اشتراکی طرز زندگی کو اختیار کیا، منصوبہ بندی کا کام شروع کیا۔ مولانا کے نزدیک تعلیم کو لوگوں میں ایسا شعور بیدار کرنا چاہئے جس کی مدد سے وہ ملکی منصوبہ بندی کے کام کو کامیاب بنا سکیں تاکہ ہندوستانی سماج اشتراکی نظام میں ڈھل جائے اور اس کو اقتصادی مساوات نصیب ہوجائے۔ یہ انکے نزدیک تعلیم کا بڑا ہی اہم مقصد ہے۔ اس طرح بالغوں کی تعلیمی اسکیم کی طرف انھوں نے جابجا اشارے کئے ہیں۔

مولانا کے نزدیک آزاد ہندوستان میں مذہب کو ایک اہم مقام ملنا چاہئے۔ اس لئے کہ ہندوستان کی صورتِ حال دوسرے ممالک سے بالکل مختلف ہے، یہ ابتدا سے مذہب کا گہوارہ رہا ہے۔ آریوں نے اس کو وید اور گیتا دی۔ مسلمانوں نے اس کو قرآن دیا۔ عیسائیوں نے بائیبل دی۔ اور ان سب مذاہب نے اخلاقی اقدار کا سرمایہ فراہم کیا۔ لوگوں کی شخصیت کا

پتلا مذہب اور اخلاقیات سے بنا ہے۔ مذہب انسانوں کو خدا پرستی کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کو رواداری اور انسان دوستی کا سبق سکھاتا ہے۔ اس لئے مذہبی تعلیم بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مولانا کے نزدیک مذہبی تعلیم ابتدائی تعلیم کا ایک حصہ ہو۔ تاکہ بچوں کو شروع ہی سے روحانیت کا درس دیا جائے۔ اور وہ بڑھ کر رواداری، انسان دوستی اور باہمی اشتراک سے کام لیں۔

تعلیم کا کام کوئی آسان کام نہیں۔ حقیقی معلم ہونا انتہائی دشوار ہے۔ معلم پہلے تو خود ایک نمونہ ہو۔ وہ ان ساری خوبیوں کا مجسم ہو جن کی وہ اپنے طلباء کو تعلیم دیتا ہے۔ اس کو اپنے طالب علموں کی پرکھ آتی ہو۔ وہ ان کی فطری صلاحیتوں کا نباض ہو۔ اس کی زندگی ان کے لئے وقف ہو۔ انہی کے لئے زندہ رہتا ہو اور اس کام کو وہ ایک فریضہ سمجھ کر ادا کرتا ہو۔ اس لئے کہ وہ اپنے ملک کی زندگی کا معمار ہے۔ اور معمار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے فن میں ماہر ہو۔ اس کے طلباء فارغ التحصیل ہو کر ملکی منصوبہ بندی میں مصروف ہوں۔ جن سے خود اس کی شخصیت جانی اور پہچانی جائے۔ اور اس طرح اس کا نام باقی رہے۔ وہ شاہ ولی اللہ، ابوالکلام، گوتم بدھ، گاندھی اور جواہر لال ہوں۔ اور اپنے ملک کی ترقی میں اپنی پوری صلاحیتیں وقف کر دیں۔ اس لئے سچے اور حقیقی معلموں کی ضرورت ہے۔ جن کے دماغ علم کی شمع سے روشن ہوں۔ جن کی شخصیات ایک نمونہ ہوں جن کو ان کے طالب علم مثال بنائیں۔ اس لئے کہ شاگرد اپنے استاد سے پہچانے جاتے ہیں تو مولانا اچھے استادوں کی ضرورت پر زور دیتے ہیں اور ان کی تربیت کو ضروری تصور کرتے ہیں۔

ایک اور اہم مسئلہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کا ہے۔ ہمارے ملک کی یونیورسٹیاں انگلستان کی یونیورسٹیوں کے نمونہ پر قایم ہوئی تھیں۔ اور آزادی ملنے تک اسی نہج پر چلتی رہیں۔ لیکن آزادی کے بعد ان کی صورت اور سیرت کو بدلنا تھا۔ ان کو ہندوستان ہی کی یونیورسٹیاں ہو کر یہاں کی علمی اور تہذیبی زندگی کا مرکز ہونا لازمی تھا۔ مولانا نے ہر موقع پر اس ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم انگریزی میں ہوتی تھی۔ دیسی زبانوں کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں تھی۔ یہ ضرور ہے کہ انگریزی کہ انگریزی دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان تھی وہ انسانی تاریخ کی ساری علمی دولت اپنے اندر رکھتی تھی۔ لیکن کتنے ہندوستانی تھے جو انگریزی سے واقف تھے۔ وہ ان کے مزاج اور ان کی تہذیبی زندگی کی عکاسی نہیں کرتی تھی۔ لوگوں کو حکومت کا وفادار بناتی تھی۔ انگریزی تہذیب کو اپنانے پر اکساتی تھی۔ آزادی کے بعد اس بات کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی گئی کہ ہندوستان کی ایک قومی زبان ہو، جس میں ساری تعلیم دی جائے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ محسوس کی گئی کہ ہندوستان کی ایک قومی زبان ہو جس میں ساری تعلیم دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ باقی دیسی زبانوں کو فروغ دینا چاہئے، تاکہ وہ انگریزی کی جگہ کو پر کر سکیں۔ کسی بھی ملک کی زبان وہاں کے لوگوں کی زندگی کی صحیح ترجمان ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ وہ اپنی شخصیات کو تکمیل کے درجات تک پہونچاتے ہیں۔ لوگ اپنی مادری زبان میں تعلیم کا کام جلد از جلد مکمل کر سکتے ہیں۔ خیالات کا اظہار طبعی آسانی کر سکتے ہیں اور اس میں وہ ایک اسلوب بھی پیدا کر سکتے ہیں، جو ان کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کرتا ہو، تو دیسی زبانوں کو بغیر کسی تعصب اور تنگ نظری سے کام لئے ہوئے جلد از جلد ترقی دینی چاہئے۔ مولانا نے اس ضرورت کو ہر موقع پر شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے مشرقی طرز پر تعلیم حاصل کی تھی اور خود بھی مشرقی تہذیب کا ایک جاندار اور خوبصورت نمونہ تھے۔

مولانا کے نزدیک ابتدائی تعلیم ہر بچہ کے لئے لازمی ہو۔ کوئی بچہ اس سے محروم نہیں رہنا چاہئے۔ ثانوی تعلیم کا انتظام بھی اچھے طریقہ پر ہونا لازمی ہے۔ تاکہ عوام کی جہالت دور ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یونیورسٹیوں کی نئے سرے سے قومی بنیادوں پر تنظیم ہونی چاہئے۔ تاکہ وہ علوم و فنون کا مرکز بن جائیں اور سماجی اصلاح کا کام خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔ اور یہ سب چیزیں مولانا کی تعلیم اسکیم میں شامل ہیں۔

باب الاستفسار

قصیدۂ مومن کے بعض مشکل اشعار

(جناب طلحہ رضوی برق - دیناپور)

شاعر نازک خیال حکیم مومن خاں مومن کا ایک مشہور قصیدہ "قصیدہ در تعریف رسالت مآبؐ" ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے:-

چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس — کہ جیسے صبح شب ہجر نالہائے خروس
ہے اس طرح فرح انگیز کوکوئے قمری — کہ جیسے فوج مظفر میں شور غلغل کوس

اسی قصیدے میں ایک "مطلع ثانی" بھی ہے جو ماقبل کے اس شعر کے بعد شروع ہوتا ہے:-

پڑھے ہے مرغ گلستاں وہ مطلع رنگیں — کہ سن کے بس جسے رہ جائے سن ہی بلبل طوس

مطلع ثانی

"زبانِ لال کہاں اور مدیح تاج خروس — گرا ہے خاک پہ کیا لعل افسرِ کاؤس"

اور فنی مدارج طے کرتا ہوا یہ قصیدہ ان اشعار پر ختم ہو جاتا ہے:-

وہ کون احمدِ مرسل شفیع ہر دو سرا — جو خلق کا سبب اور باعثِ معاد نفوس
جہاں مطاع شہنشاہِ آفتاب نشاں — فلک سریر و قمر طلعت و ملک ناموس

قصیدے کے "قصیدہ" ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے، لیکن مومن کی دقیق فلسفیانہ اکیب اور ناماںوس الفاظ (ہر چند ناماںوس کا قافیہ استعمال نہیں ہوا ہے) بہ روایت قصیدہ، حد سے زیادہ ہیں تاہم قاری، خصوصاً مجھ جیسا نافہم کسی حد تک سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن پیش نظر قصیدے میں مطلع ثانی

"زبانِ لال کہاں اور مدیح تاج خروس — گرا ہے خاک پہ کیا لعل افسرِ کاؤس"

میری سمجھ سے قطعی بالاتر ہے۔ میں نے اکثر اساتذہ سے اسے سمجھنے کی کوشش کی اور ان بزرگوں نے بھی ہر چند معنی و مطلب نکالے مگر میرا ناقص ذہن اسے قبول کرنے سے قاصر رہا۔ شعر کے دونوں مصرعوں میں کیا ربط ہے؟ "زبانِ لال" کا "مدیح تاج خروس" ہونا اور "لعلِ افسرِ کاؤس" کا خاک پر گرنا کیا نسبت رکھتا ہے؟ کیا کوئی خاص استعارہ و کنایہ ہے؟ یا اس مطلع کا شعر ماقبل سے

"پڑھے ہے مرغ گلستاں وہ مطلع رنگیں — کہ سن کے بس جسے رہ جائے سن ہی بلبل طوس"

سے کوئی تعلق ہے؟ ممکن ہے مرغ گلستاں کے پڑھنے ہی میں کوئی نکتہ چھپا ہو جسے میں اب تک نہ سمجھ سکا۔
ازراہِ کرم اس "مطلع ثانی" کی وضاحت سے مطلع کریں، عین نوازش ہوگی۔ امید کہ محروم نہ فرمائیں گے۔

(نگار) قصاید مومن کا ذکر کر کے آپ نے مجھے بے چین کر دیا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب دنیا اس کی زبان کو بے تکلف سمجھ لیتی تھی اور

آج وہ وقت آیا ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ بھی اس کے سمجھنے سے عاری ہیں۔ فہل من مدکر!

مومن کو غزل گو شاعر کی حیثیت سے تو سب لوگ جانتے ہیں، لیکن قصیدہ نگار ہونے کی حیثیت سے اس کی عظمت کا علم کم لوگوں کو حاصل ہے۔ حالانکہ اس صنفِ سخن میں بھی (سودا کو چھوڑ کر) وہ بڑے مرتبہ کا مالک تھا اور جوشِ بیان و ندرتِ خیال تو اس کا حصہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مومن کے بعض قصاید بہت دقیق ہیں اور جیسا کہ آپ نے ظاہر کیا ہے ان میں نامانوس الفاظ کی بھی کمی نہیں، لیکن آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ مومن نے یہ قصاید اس وقت لکھے تھے جب یہ الفاظ لوگوں کے لئے اتنے غیر مانوس نہ تھے۔

اُس وقت قصیدہ نگاری کی فنی خصوصیت یہی تھی کہ شاعر اپنا تبحر علمی ظاہر کرنے کے لئے اپنی پوری قوت سے کام لے اور ندرتِ خیال و جوشِ بیان سے اس میں اچنبھا پن پیدا کر دے۔ چنانچہ مومن نے بھی اپنے بعض قصاید میں اس خصوصیت کا پورا لحاظ رکھا، اور طب، حکمت و نجوم وغیرہ کی اصطلاحات سے کام لے کر ان کو بہت مشکل بنا دیا۔

آپ نے جس قصیدہ کا ذکر کیا ہے وہ مومن کا بڑا اہم قصیدہ ہے جس میں قصداً ایسا قافیہ اختیار کیا گیا کہ بہت سے دقیق و نامانوس قافیوں کا استعمال ناگزیر ہو جائے۔

آپ نے جس شعر کا ذکر کیا ہے وہ اتنا مشکل نہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کے اساتذہ کیوں آپ کو مطمئن نہ کر سکے۔

زبان لال کہاں اور مدیحِ تاج خروس گرا ہے خاک پہ کیا لعل افسرِ کاؤس

زبانِ لال = (گونگی زبان) ـــــ مدیح = (تعریف) ـــــ تاجِ خروس = (ایک سُرخ پھول جسے مرغ کیس بھی کہتے ہیں)
افسر = (تاج) ـــــ کاؤس = (ایران کے کیانی خاندان کا ایک مشہور بادشاہ)۔

مومن یہ کہنا چاہتا ہے کہ "میری زبانِ گنگ، تاجِ خروس (کنایہ ہے ذاتِ نبوی کی طرف) کی تعریف سے قاصر ہے" ـــــ اور پھر دوسرے مصرع میں تشبیہی صورت سے یہ کہہ کر کہ "وہ تاجِ خروس ہے یا تاج کاؤس کا کوئی لعل"۔ تعریف بھی کر دی ہے۔

اس مطلع سے پہلے تشبیب کا آخری شعر ملاحظہ فرمائیے:-

پڑھے ہے مُرغِ گلستان وہ مطلعِ رنگیں کہ سن کے بس جسے رہ جائے سن ہی بلبلِ طوس

اور اسی گلستان و مرغِ گلستان کی رعایت سے اس نے مطلع میں تاجِ خروس کا ذکر کیا ہے، جو عام طور پر باغ میں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔

یہاں تک تو آپ کے سوال کا جواب ہو گیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس قصیدے کے بعض اشعار اس سے زیادہ مشکل ہیں مثلاً

۱- غبارِ صحنِ چمن کیمیائے عیش و نشاط بہارِ لالہ و گل سیمیائے عرضِ شموس

اس قصیدہ کی تشبیب بہار پر ہے اور موسمِ بہار میں لطف و رنگینی کا جو انتہائی تصور ذہن میں آسکتا ہے اسے مومن نے مختلف پیرایوں میں پیش کیا رہا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں بھی وہ اسی کا اظہار کرتا ہے کہ صحنِ چمن کا غبار بھی حصولِ عیش و نشاط کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے اور لالہ و گل کی کثرت کا یہ عالم ہے گویا علم نیرِ نجات نے ہر طرف آفتاب ہی آفتاب بکھیر دئے ہیں ـــــ
عرض = (پیش کرنا) ـــــ شموس = (جمع شمس)

۲- نہ ہے فریبِ صفا خاک بیز ہے گلچیں پڑے جو وسعتِ گلزار میں گلوں کے عکوس
(جمع عکس)

اس سے قبل کے شعر میں اس نے باغ کے در و دیوار کی صیقل و صفائی کا حال بیان کیا ہے کہ آشیانے میں طائروں تک کے پاؤں نہیں جمتے اور اس شعر میں صحن چمن کی صفائی کا ذکر کیا ہے کہ اس کی خاک پر پھولوں کا عکس اس طرح پڑ رہا ہے کہ گلچیں کو اس پر پھولوں کا دھوکا ہو جاتا ہے اور وہ خاک سمیٹنے لگتا ہے۔

۳- ہے دشت بزم طرب کثرت نتائج سے نہ کیوں ہو شکلِ حماری کو نازِ شکلِ عروس

اس میں اقلیدس کی اصطلاحات سے کام لیا گیا ہے۔ شکل حماری اور شکل عروسی دونوں اقلیدس کی شکلیں ہیں اور شکل عروسی بہت کثیر النتائج شکل ہے۔

۴- مزاج دہر میں یہ اعتدال آیا ہے کہ جس نبات کو دیکھو وہ صالح الکیموس

طبی اصطلاح میں کیموس ہضم ثانی کو کہتے ہیں جس سے خون صالح پیدا ہوتا ہے۔

۵- نمو کا معجزہ صلِ علیہ، پھر گندم ہوائے جنبش غربال سے بنے ہے سبوس
(سبوسی) (چھلنی)

جوش نمو کا یہ عالم ہے کہ چھلنی کی ہوا سے بھوسی پھر گیہوں بن جاتی ہے۔

۶- صفات آئے جو آئینۂ ہوا میں نظر لگا خواص و عوارض کو اعتبارِ نفوس

اس شعر میں فلسفہ سے کام لیا گیا ہے۔ دنیا میں اعیان کا تعلق دو چیزوں سے ہے، ایک نفس، جوہر یا ذات۔ دوسرے نفس کے صفات جنھیں "خواص و عوارض" بھی کہتے ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو مستلزم ہیں، نہ اعراض بغیر جوہر کے پائے جا سکتے ہیں، نہ جوہر کو بغیر اعراض کے مشخص کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً پھول کو وہ بجائے خود جوہر ہے لیکن ہم اس کا تشخص نہیں کر سکتے جب تک اس کے اعراض (رنگ، پتیاں اور حجم وغیرہ) سامنے نہ ہوں۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہوائے چمن اس قدر شفاف و متجلی ہے کہ اس کے آئینہ میں خواص و عوارض بھی نفوس ناطقہ بن کر سامنے آجاتے ہیں۔

۷- سیاہ چشموں کو مشکل نگاہِ دزدیدہ یہ اُس کے حفظ سے ہے ملک معدلت محروس

ممدوح کے عدل و انصاف کا یہ عالم ہے کہ چوری کے نام سے معشوقوں کو "نگاہ چرانا" بھی مشکل ہو گیا ہے۔

۸- طبیب وہ ہوں کہ ہو سوزِ سینۂ بلبل نظارۂ رخِ گلفام سے مجھے محسوس

میری طبی مہارت کا یہ حال ہے کہ میں معشوق کے پھول سے چہرہ کو دیکھ کر دلِ بلبل کی حرارت محسوس کر لیتا ہوں۔

۹- گواہ عصمت مریم ہو کثرتِ اولاد عقیمہ مجھ سے سنے گر بیان شکلِ عروس

اقلیدس کی ایک شکل کا نام "شکلِ عروس" جس سے ریاضی کے بہت سے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی بانجھ عورت مجھ سے شکل عروس کا بیان سن لے تو بانجھ پن دور ہو کر بہ کثرت اس کی اولاد پیدا ہو اور اس طرح عصمتِ مریم کی ایک اور

گواہی مل جائے کیونکہ انھوں نے بھی بغیر شوہر کے مسیح کو جنم دیا تھا۔

یہ پورا قصیدہ ایسے ہی دقیق اشعار پر مشتمل ہے، جن کی تشریح و وضاحت کا موقع نہیں، لیکن اس میں جو مشکل و نامانوس قافیے و الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان کے معنی یہاں درج کئے دیتا ہوں تاکہ اشعار کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

سدوس = سبز رنگ کی ریشمی چادر
منکوس = اُلٹا (سیدھے کا ضد)
ایلاؤس = ایک بیماری جس میں براز قے کے ذریعہ سے خارج ہونے لگتا ہے۔
افیوس = سیاہ رنگ کا ایک پھل
جعل = گبریلا (ایک کیڑا جو گوبر میں رہتا ہے)
سُوس = ایک کیڑا جو ریشمی کپڑے کو چاٹ جاتا ہے۔
شاموس = سنگ جراحت
دختر طیموس = زلیخا
قربوس = زین کا اگلا حصہ
جاموش = بھینسا
قاموس = سمندر
کیوس = کاسہ کی جمع
بسّوس = ایک اسرائیلی عورت کا نام
غموس = جھوٹی قسم
دبّوس = گرز
الکوس = شاہنامہ کا ایک پہلوان
دساوہ = مسند
مطموس = مٹا ہوا
مدروس = کہنہ - پُرانا
دُعائے بدریطوس = ایک خاص دُعا جدائی پیدا کرنے کی

اگر آپ ادبی و تنقیدی لٹریچر چاہتے ہیں تو یہ سالنامے پڑھئے

اصناف سخن نمبر = قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول ۔ حسرت نمبر = قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول ۔ مومن نمبر = قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول
ریاض نمبر = قیمت دو روپیہ علاوہ محصول ۔ داغ نمبر = قیمت آٹھ روپیہ علاوہ محصول ۔ (جلد عنقریب ۲۵)

لیکن یہ سب آپ کو بیس روپیہ میں مع محصول مل سکتے ہیں اگر یہ رقم آپ پیشگی بھیجدیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

باب المراسلہ والمناظرہ

احمدی جماعت

(غبار یاور - کراچی)

حضرت محترم

قادیانیت کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا وہ بظاہر صحیح اور بہ باطن غلط ہے۔ ان لوگوں نے انگریزی زبان میں جتنا لٹریچر شایع کیا ہے وہ نہایت عمدہ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ لیکن دوسرے ملکوں خصوصاً اسلامی ملکوں میں یہ لوگ اختلافی مسایل کو بالکل نہیں اُبھارتے بلکہ عام مسلمانوں ہی کے خیالات پیش کرتے ہیں۔

ان لوگوں نے ایک تحریک یہ بھی چلائی تھی کہ کعبہ سے اسود کا ایک ٹکڑا لاکر وہاں نصب کیا جائے، لیکن اُس شخص کو جس نے یہ حرکت کی سعودی حکومت نے قتل کرا دیا تھا۔ پنجاب میں ان لوگوں نے اس طرح یہ تحریک چلائی تھی جیسے قرامطہ اور بابلیوں کی - ایک طوفان قتل و غارت گری اور ہنگامہ مچا رکھا تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ طریقہ کارگر نہ ہوا اور ختم ہوگیا۔

پاکستان میں ان کا مستقر ربوہ ہے۔ یہاں پر قصر نبوت، قصر خلافت، قصر ام اقدس اور جنت اور دوزخ بھی ہے اور جن سے عیاشی کا سلسلہ بھی موجود ہے جیسا قدیم عبادت گاہوں میں ہوتا تھا۔ یہ باتیں بڑی تفصیل چاہتی ہیں۔ آپ نے جو ان کی کامیابیوں کا ذکر کیا ہے بہ ظاہر وہ کامیابیاں نظر آتی ہیں لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ ان کے اثرات نے کتنا فاسد مادہ پیدا کر دیا ہے۔ ان کے پاس اچھے وسایل ہیں تنظیم مضبوط ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے نتائج بھی ایسے ہی ہونگے

پاکستان آنے کے بعد میں نے ان کا وہ لٹریچر بھی پڑھا جو اُردو میں تھا اور جس میں وہ اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہوئے ہیں۔ مرزا صاحب مرحوم بڑے قابل انسان تھے۔ اُنیسویں صدی تک تو وہ بڑی معقول باتیں لکھتے رہے لیکن یکایک ان کا دماغی توازن بگڑا اور نہ جانے کیوں ہذیان بکنے لگے۔ میرا خیال ہے کہ اُن کی زندگی کے آخری دس بارہ سالوں کی تحریروں نے ان کی علمیت و قابلیت کو سخت نقصان پہونچایا، پاکستان میں آج کل قادیانی مشن کا یہ طریقہ ہوگیا ہے کہ ان کی ابتدائی تحریروں کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ منظر عام پر لاکر انھیں ایک عظیم فلسفی کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

مرزا صاحب شاعر بھی تھے - شاعری کے لوازم یعنی ذوق وجدان سے بالکل بے بہرہ تھے - مگر ان کے کلام کا اس نظر سے مطالعہ کرنا چاہئے کہ اس میں مرزا صاحب نے اپنے نبی اور مسیح ہونے کا نہایت مضحک نقشہ کھینچا ہے -

---

دراصل اس جماعت میں پڑھے لکھے اور بڑے بڑے لوگ شامل ہیں - ان کا انداز تحریر نہایت عمدہ، مدلل اور موثر ہوتا ہے - لہذا ان لوگوں کو متاثر کرتا ہے جو خود بھی اپنا نقطۂ نظر مولویانہ نہیں رکھتے - میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ علماؤں کی طرف سے اُن پہ جو اعتراضات کئے گئے وہ نہایت سطحی قسم کے تھے - اس میں قصور علماء یا ان کے اسلام کا نہیں ہے بلکہ اس نظریت کا ہے جس کو یہ بیچارے آج تک طوق کی طرح اپنے کاندھے پہ رکھے ہوئے ہیں -

---

قادیانی عقاید کو اگر جمہور مسلمانوں کے لئے درست بھی تسلیم کرلیا جائے تو ختم نبوت کے مسئلہ کو کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے ..... یہ لوگ اس سے انکار تو نہیں کرتے لیکن ایسی عجیب وغریب تاویلیں کرتے ہیں جنھیں عقل قبول نہیں کرتی - (اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو تاویلیں ہمارے مولوی کرتے ہیں وہ سب ماننے کے لایق ہیں آج کل اس بارے میں قادیانی حلقوں کی جانب سے جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کی نوعیت زیادہ تر علمی اور فلسفیانہ ہے اور جس کی صورت تاویلی اور تنزیلی دونوں ہے - قرآن کے حوالے دیتے ہیں - لفظوں کے عجیب عجیب معنی بیان کرتے ہیں - صحابہ اور صوفیا کے اقوال اور احادیث پیش کرکے اپنے دلایل کو موثر بناتے ہیں - اور یہ عمل اب اس حد تک ترقی کرگیا ہے کہ مرزا صاحب نے انفرادی اور تحریری خیالات کی نفی ہونے لگی ہے - یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ جماعت مرزا صاحب کی رائے کے برخلاف استدلال اور معقولیت کا ساتھ دے رہی ہے - خود مرزا صاحب نے اقرار کے پردے میں جس طرح انکار کیا ہے اس کا مفصل حال تو ان کی تحریروں میں موجود ہے - البتہ اس کا لب لباب پیش کئے دیتا ہوں :-

۱- اللہ نے نبوت محمد (صلعم) پہ ختم کردی
۲- اب اگر نبوت ملے گی تو محمد سے (اللہ سے نہیں) ؟
۳- نمبر ۱ کے مطابق محمد آخری نبی ہیں
۴- نمبر ۲ کے مطابق محمد خاتم انبیا ہیں
۵- نمبر ۳ کے مطابق محمد نے انبیا کی صداقتوں پر مہر ثبت کی
۶- صرف امت محمدی نبوت کی حقدار ہے -
۷- میں (یعنی مرزا صاحب) چونکہ امتی ہوں لہذا نبی ہوں -

اس کے علاوہ ناسخ منسوخ، وفات عیسیٰ، ظہور مہدی، اور حقیقت رسول کے مسئلے بھی ایسے نہیں ہیں جنھیں سرسری سمجھا جائے -

میں نے آج تک کبھی اس قسم کی بحثوں میں حصہ نہیں لیا - اور اگر کہیں اور سے کسی مذہبی حلقے سے یہ آواز اُٹھتی تو توجہ بھی نہ دیتا - لیکن چونکہ یہ گفتگو آپ نے نگار میں شروع کی جو غالباً اس کے شایان شان نہیں لہذا میں نے اپنی ذاتی رائے لکھنا ضروری خیال کیا - ممکن ہے یہ غلط ہو یا صحیح - اس کا فیصلہ آپ کے ذمہ ہے - آپ نے اب تک جو کچھ لکھا اور چھاپا ہے غالباً وہ سب میری نظر سے گزرا ہے لیکن ایسی غیر ذمہ دارانہ بات جس میں حقیقت

کے صرف ایک سبک پہلو کو اُلجھایا گیا ہے، یا دنہیں پڑتا کہ کہیں اور دیکھی ہو۔
مجھے احساس ہے کہ میں بڑی قطعیت سے گفتگو کر رہا ہوں لیکن اختلاف کو محض اختلاف سمجھتے ہوئے غالباً اس کا کوئی خیال نہ کریں گے بلکہ قدر کریں گے۔

(نگار) میں نے چاہا تھا کہ آپ کے خط کا جواب خط ہی کے ذریعہ سے دے کر خاموش ہو رہوں، لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے آپ ہی کی طرح بعض اور اصحاب بھی کچھ ایسے ہی شبہات اپنے دل میں رکھتے ہوں، نگار کے ذریعہ سے گفتگو کرنا زیادہ مناسب نظر آیا۔

سب سے پہلے مجھے یہ حقیقت واضح کر دینا چاہئے کہ احمدی جماعت کے متعلق میں نے جو خیال ظاہر کیا ہے، اس کا خود میرے عقیدہ سے کوئی واسطہ نہیں، کیونکہ جس حد تک اصطلاحی ایمان کی تفصیل اور اس کے مابعد الطبیعیاتی عقاید کا تعلق ہے (جس میں حشر و نشر، دوزخ و جنت، وجود ملائکہ، بقاء روح و معجزہ وغیرہ کا مادی تصور شامل ہے) میرا مسلک کچھ اور ہے۔ میں ان میں سے کسی چیز کے مادی و محسوس وجود کا قایل نہیں۔ لیکن میرا یہ انکار صرف اس لئے ہے کہ ان میں سے کوئی بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی اور نہ میرے نزدیک خدائے واحد کی صحیح عظمت کا تصور اس وقت تک ممکن ہے، جب تک ان تعینات مادی سے بلند ہو کر اس کی کبریائی پر غور نہ کیا جائے۔ اور پھر یوں بھی طاعت و عبادت کے لئے "مے و انگبیں" کی لاگ مجھے پسند نہیں۔
تاہم میرا یہ انکار قطعاً غیر جارحانہ ہے، یعنی اگر کوئی جماعت بلندی اخلاق کے حصول کے لئے ان تمام باتوں کا صحیح تسلیم کرنا ضروری سمجھتی ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں وہ شوق سے اپنے عقاید پر قایم رہے، بشرطیکہ ان عقاید کے مقابلہ میں وہ اصلاح اعمال و کردار کو ثانوی حیثیت نہ دے اور صرف ان عقاید یا ظاہری طاعت و عبادت ہی کو مذہب کا تنہا نصب العین نہ قرار دے جیسا کہ آج کل عام طور پر دیکھا جا رہا ہے۔

علماء اسلام سے میرے اختلاف کا باعث یہی ہے کہ وہ اسلام کو رسمی طاعت و عبادت کی سطح سے اوپر لے جانا ضروری نہیں سمجھتے اور میں طاعت و عبادت کو ثانوی درجہ دے کر محض تزکیۂ نفس و اعمال کو اسلام کا حقیقی مقصود قرار دیتا ہوں۔ ممکن ہے آپ یہ خیال فرمائیں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ محض ظن و تخمین ہے لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ بالکل حقیقت ہے۔ کیونکہ میں نے ایک بار مختلف جماعتوں کے علماء سے بھی استفسار کیا تھا کہ اصل چیز عبادت ہے یا پابندی اخلاق ہے تو سوا چند احمدی علماء کے سب نے یہی جواب دیا تھا کہ اصل چیز شعائر اسلام کی پابندی ہے اور محض اخلاق کی پاکیزگی موجب نجات نہیں ہو سکتی۔
پھر ظاہر ہے کہ وہ شخص جو مذہب کا اتنا وسیع مفہوم اپنے سامنے رکھتا ہو وہ اگر کسی مذہبی جماعت کی بابت کوئی رائے قایم کریگا تو اس کے سامنے سوال صرف اُس جماعت کی عملی زندگی کا ہوگا، نہ یہ کہ اس کے عقاید کیا ہیں اور اس کی طاعت و عبادت کے طریقے کیا؟ — اور — یہی وہ چیز تھی جس نے مجھے احمدی جماعت کی تعریف کرنے پر مجبور کر دیا، کیونکہ اس وقت تمام ان جماعتوں میں جو اپنے آپ کو اسلام سے منسوب کرتی ہیں، صرف یہی ایک جماعت ایسی ہے جو بانی اسلام کی متعین کی ہوئی شاہراہ زندگی پر پوری استقامت کے ساتھ گامزن ہے — اور — گو اس کا احساس تنہا مجھی کو نہیں بلکہ احمدی جماعت کے مخالفین کو بھی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ مجھے اس کے اظہار میں باک نہیں اور ان کی رعونت نفس یا احساس کمتری اس اعتراف سے باز رکھتا ہے۔
بات بڑھتی جا رہی ہے لیکن غالباً بے محل نہ ہوگا اگر اس سلسلہ میں یہ بھی ظاہر کر دوں کہ گزشتہ نصف صدی کے عرصہ میں جو زیادہ تر مولویوں ہی سے جنگ کرنے میں گزرا ہے، میرا خیال کیوں احمدی جماعت کی طرف منتقل نہیں ہوا اور اب وہ کونسی نئی بات ایسی پیدا ہو گئی جس نے مجھے دفعتاً اس طرف متوجہ کر دیا۔

اس کا سبب صرف یہ ہے کہ میں اس عرصہ میں صرف اس بات پر غور کرتا رہا کہ مسلم جماعت کیوں اس قدر اقتصادی زبوں حالی اور اخلاقی پستی میں مبتلا ہے - وہی قرآن جو صحابہ کے زمانہ میں تھا اب بھی جوں کا توں موجود ہے - وہی تعلیمات اسلامی جس کی بدولت عرب کے بادیہ نشینوں نے اکاسرہ وقیاصرہ کی عظیم الشان حکومتوں کا تختہ اُلٹ کر رکھدیا تھا، اب بھی علیٰ حالہا قایم ہے، لیکن آج مسلمان وہ نہیں ہے جو پہلے تھا - یقیناً یہ رجعت قہقری ہم کو پیروانِ اسلام ہی میں نہیں بلکہ دوسرے مذاہب وادیان کی تاریخ میں بھی نظر آتی ہے اور جب ہم ان کے عروج و زوال کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو صرف ایک ہی نتیجہ پر پہونچتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں انقلابات کتابوں نے نہیں بلکہ ہمیشہ شخصیتوں نے پیدا کئے ہیں - یعنی جب تک کوئی اُبھارنے والی شخصیت موجود رہی تو قوم بھی ترقی کرتی رہی اور جب وہ شخصیت فنا ہوگئی تو قومی ترقی بھی رُک گئی اور رفتہ رفتہ پھر لوٹ کر اسی نقطہ تک پہونچ گئی جہاں سے وہ آگے بڑھی تھی -

اس لئے اگر مسلمان اس وقت تباہ و برباد ہیں تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ان میں اب کوئی شخصیت ایسی موجود نہیں جو عملاً ان کو تعلیمات قرآنی کی طرف لے جائے - حالانکہ ہمارے علماء واکابرین ہی میں سے کسی ایسی شخصیت کو اُبھرنا چاہئے تھا لیکن نہیں اُبھری -

یہ تجربہ اس میں شک نہیں میرے لئے بڑا دردناک تھا اور اس خیال سے کہ ممکن ہے کوئی تحریک ہمارے علماء میں پھر زندگی پیدا کردے، میں نے بعض عملی پروگرام بھی ان کے سامنے پیش کئے لیکن افسوس ہے کہ اس تن پرور وعیش کوش جماعت نے متعلق توجہ نہیں کی اور جب ان کی طرف سے مایوس ہوکر میں نے دوسری جماعتوں کے حالات کی جستجو شروع کی، تو آخر کار نگاہ جاکر ٹھہری احمدی جماعت پر - جیسا کہ میں اگست کے نگار میں ظاہر کرچکا ہوں، اس جماعت کے متعلق میں کوئی اچھا خیال نہ رکھتا تھا، لیکن جب میں نے اس کے موسس و بانی کی زندگی، اس کی تعلیمات اور تنظیم پر غور کیا تو ماننا پڑا کہ اس وقت صرف یہی ایک جماعت ایسی ہے جس نے اس نکتہ کو سمجھا کہ اصل ایمان محض اقرار باللسان نہیں بلکہ اقرار بالعمل ہے اور اپنی مضبوط تنظیم و استقامت کردار سے زندگی کی راہیں بدل دیں، ذہنی اقدار بدار لئے، زاویۂ فکر و نظر بدلدیا اور مسلمانوں کو پھر اس راہ پر لگا دیا جو بانیِ اسلام نے متعین کی تھی -

پھر یہ بات ایسی نہیں جس پر کسی منطقی حجت لانے کی ضرورت ہو، خود غور کیجئے کہ آپ کی اور احمدی جماعت کی زندگی میں کتنا نمایاں فرق ہے — آپ کے یہاں زندگی نام ہے منتشر انفرادی تشخص کا، اور ان کے یہاں مرکزی ہیئت اجتماعی کا - آپ کی اجتماعیت، افراد میں بٹ کر "ہباءً منثورا" ہوچکی ہے اور ان کے یہاں تمام افراد سمٹ کر صرف ایک "حبل المتین" سے وابستہ نظر آتے ہیں - آپ کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور وہ اس بکھرے ہوئے شیرازہ کے اوراق کو اکٹھا کر رہے ہیں -

ان کی سادہ معاشرت، ان کی سادہ زندگی، ان کا جذبۂ خلوص و صداقت، احساس ایثار و قربانی، پاسِ عہد، پابندیِ شریعت، اور سب سے زیادہ ان کی عملی استقامت اور شدائد کے مقابلہ میں فلسفیانہ صبر و ضبط — یہ ہیں احمدی جماعت کے وہ بنیادی عناصر و اجزاء جن پر ان کے قصرِ اجتماعیت کی تعمیر ہوئی ہے اور جن سے اعراض کرکے دوسری مسلم جماعتیں اپنے وجود کو ختم کرچکی ہیں -

پھر آپ ان حقایق کو تو سامنے رکھتے نہیں اور مجھے اُلجھانا چاہتے ہیں عقایدی فروع و زوائد میں جو میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے -

تو از آتش دُخاں بینی، من آتش از دُخاں بینم

آپ کو اس آگ میں صرف دھواں ہی دھواں نظر آتا ہے اور مجھے اس کے دھوئیں میں بھی آگ ہی آگ نظر آتی ہے -

ولستان ما بین الخلِ والخمر !

بانی احمدیت کے متعلق میرا مطالعہ ہنوز تشنۂ تکمیل ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ مرزا صاحب کی سیرت، ان کی تعلیمات، ان کی دعوتِ اصلاح، ان کے تفہیمیاتِ قرآنیہ، ان کے عقایدی نظرئے اور ان کے تمام عملی کارناموں کو سمجھنے کے لئے کتنا زمانہ درکار ہوگا کیونکہ ان کی وسعت و ہمہ گیری کا مطالعہ "قلزم آشامی" چاہتا ہے اور یہ شاید میرے بس کی بات نہیں، تاہم اگر اسوقت تک کے تمام تاثرات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے پر مجھے مجبور کیا جائے تو میں بلا تکلف کہہ دوں گا کہ وہ بڑے غیر معمولی عزم و استقلال کا صاحب فراست و بصیرت انسان تھا جو ایک خاص باطنی قوت اپنے ساتھ لایا تھا اور اس کا دعوائے تجدید و مہدویت کوئی پاور ہوا بات نہ تھی"۔

اس سلسلہ میں آپ مجھ سے "کیوں اور کیا" کا سوال نہ کیجئے، کیونکہ یہ گفتگو بہت تفصیل چاہتی ہے اور اس وقت موضوع کچھ اور ہے تاہم آپ کے خط کے پیش نظر مجھے اس قدر ضرور عرض کرنا ہے کہ آپ نے جو الزامات اس جماعت پر قایم کئے ہیں ان میں سے اکثر بالکل لغو و غلط ہیں اور بعض مطلقاً آپ کے مرعوبات سے تعلق رکھتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔

۱۔ آپ کا یہ خیال کہ احمدی جماعت اسلامی ممالک میں اپنے حقیقی عقاید پیش نہیں کرتی، صحیح نہیں۔ اول تو آپ کو یہ سمجھنا چاہئے کہ اگر غیر ممالک میں وہ انھیں عقاید کی تبلیغ کرتے جو عام مسلمانوں کے ہیں تو یقیناً ان سے یہ سوال کیا جاتا کہ جب آپ کے عقاید بھی وہی ہیں جو مسلم جمہور کے، تو پھر ایک علٰحدہ جماعت بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن آج تک کسی نے یہ سوال ان سے نہیں کیا۔ ان کے جتنے اخبارات و رسایل دوسری زبانوں میں شایع ہوتے ہیں ان کے مطالعہ سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ وہ اپنے عقاید کو کبھی نہیں چھپاتے اور علی الاعلان وہی کہتے ہیں جسے وہ حق سمجھتے ہیں یہاں تک کہ خود بانی احمدیت کی کتابوں کے ترجمے بھی غیر زبانوں میں اسی غرض سے شایع کئے گئے کہ احمدیت کے صحیح مشن سے دنیا آگاہ ہوجائے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ افغانستان میں ایک مبلغ کو تہ تیغ کیا گیا محض اس جرم میں کہ وہ احمدی عقاید کی تبلیغ میں مصروف تھا اور دمشق میں بھی دوسرے مبلغ پر قاتلانہ حملہ اسی جرم میں کیا گیا۔ جب ۲۴ء میں بانی احمدیت پیمبلے کی مذہبی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن گئے تو جاتے ہوئے دمشق میں بھی قیام کیا اور وہاں کے علماء سے بھی انھیں مخصوص عقاید کے پیش نظر مناظرہ ہوا۔ ان حالات میں آپ کا یہ ارشاد کہ غیر ممالک کے لئے ان کے تبلیغی اصول کچھ اور ہیں، یقیناً نادرست ہے۔ آپ نے یہ خیال غالباً لندن کے اسلامک ریویو کو دیکھ کر قایم کیا ہوگا لیکن آپ کو شاید معلوم نہیں کہ اسے احمدی جماعت سے کوئی تعلق نہیں۔

۲۔ کعبہ سے سنگِ اسود کا ایک ٹکڑا چرا لانے کی تحریک کے متعلق اس کے سوا کیا عرض کروں کہ

سادگی ختم ست چوں آئینہ بر نسیانِ ما

حیرت ہے کہ آپ نے اسے کیسے باور کرلیا۔ غور کیجئے کہ وہ ایسا کیوں کرتے؟ کیا اس لئے کہ وہ قادیان کو دوسرا کعبہ بنانا چاہتے تھے کیا اس لئے کہ وہ برکات سماوی کا کوئی بڑا مہبط ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ حرمین کی عزت و عظمت کا جو تصور ان کے سامنے ہے وہ مشکل ہی سے کسی دوسری مسلم جماعت میں پایا جاتا ہے، لیکن اس کا تعلق نہ سنگِ اسود سے ہے نہ غلافِ کعبہ سے بلکہ اس حقیقت سے کہ ان مقامات کو دنیا کے سب سے بڑے نبی کے مولد و مہبط ہونے کی عزت حاصل ہے اور یہ نسبت چرائی نہیں جاسکتی۔

احمدی جماعت اور اس کے قائدین چاہے کچھ ہوں لیکن اتنے احمق کبھی نہیں ہوسکتے کہ وہ اس حرکت سے خود اپنے مشن کو ناقابل تلافی نقصان پہونچاتے۔

۳۔ ربوہ میں قصرِ نبوت اور قصرِ اقدس کے نام سے کوئی عمارت موجود نہیں، آپ کی اطلاع بالکل غلط ہے، خلیفہ کی قیام گاہ کا نام البتہ انھوں نے "قصرِ خلافت" رکھا ہے، لیکن جب انھوں نے ایک شخص کو خلیفہ و امام تسلیم کرلیا ہے تو ظاہر ہے اس کی جائے قیام کو خلافت ہی سے منسوب کریں گے اور اسی نسبت سے اس کو یاد کرنا زیادہ مناسب ہے۔ ممکن ہے لفظ قصر پر آپ کو

اعتراض ہو کہ اس سے بُوئے دولت و ثروت آتی ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ عربی میں لفظ قصر مطلقاً جائے قیام اور گھر کے معنی میں مستعمل ہے، یہاں تک کہ اگر ایک کوٹھری بھی پتھر چُن کر بنالی جائے تو اسے قصر کہہ سکتے ہیں۔

قادیان اور ربوہ میں نبی و عقایدی سلسلہ کے لوگوں کے لئے بے شک قبرستان موجود ہے جنھیں وہ "مقبرۂ بہشتی" کہتے ہیں لیکن اس پر ناک بھوں چڑھانے کی کوئی وجہ نہیں اگر آپ مرنے والوں کے نام کے ساتھ مرحوم و مغفور کا اضافہ کرتے ہیں تو انکے مدفن کو بہشتی مقبرہ کہنے میں کیا حرج ہے۔ اگر مرحوم و مغفور کہنا کوئی تمنا یا دُعا ہے تو قبرستان کو بھی بہشت سے منسوب کرنا اسی قبیل کی چیز ہے۔ رہا یہ امر کہ وہ قحاشی کا گھر ہیں سو احمدیت کے خلاف ایسے اوچھے ہتھیار استعمال کرنا مناسب نہیں، کیونکہ اس سے ان کو تو کوئی نقصان نہیں پہونچتا، آپ ہی کا احساس کمتری ضرور سامنے آجاتا ہے۔

۴۔ آپ نے ایک جگہ یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ ان کی تحریک قرامطہ و باطنیوں کی سی تھی۔ یہ پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔ معلوم ہوتا ہے نہ آپ نے قرامطہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور نہ احمدی جماعت کی زندگی کا۔ کجا قرامطہ و باطنیین جن کی تحریک کی بنیاد ہی قتل و خونریزی پر قایم تھی اور کجا احمدیین جن پر ہمیشہ ظلم کیا گیا اور جنھوں نے اپنے شجر ایمان کی آبیاری ہمیشہ اپنے خون سے کی۔ حال ہی میں پاکستان کے اندر محض ایک جھوٹے پروپاگنڈا پر کہ وہ رسول اللہ کو خاتم النبیین تسلیم نہیں کرتے، انتہائی بیدردی کے ساتھ ان کو قتل و ذبح کیا گیا، لیکن یہ سب کچھ انھوں نے انتہائی صبر و ضبط سے برداشت کیا اور آخر کار اسی سرزمین میں جہاں ان کا خون بہایا گیا تھا، ربوہ میں اپنا زبردست ادارہ قایم کرکے دکھادیا کہ

عشق ہر جا می رود ما را بہ ساماں می برد

۵۔ آپ نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ آج کل مرزا صاحب کی تحریروں کو ایک عظیم فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا جارہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے قبل اس حیثیت سے پیش نہیں کیا جاتا تھا، حالانکہ مرزا صاحب جو تحریریں اب پیش کی جارہی ہیں وہ پہلے بھی موجود تھیں اور اگر ان تحریروں میں آج فلسفہ پایا جاتا ہے تو پہلے بھی پایا جاتا ہوگا۔ آپ کا یہ اعتراض بالکل میری سمجھ میں نہیں آیا۔

۶۔ آپ نے اس امر کے ثبوت میں کہ مرزا صاحب، رسول اللہ کو خاتم النبیین نہیں سمجھتے تھے اور اس پر جو صغریٰ کبریٰ قایم کیا ہے وہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ آپ ایک طرف خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ محمدؐ کو خاتم النبیین سمجھتے تھے اور دوسری طرف اس کی تردید بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو یقیناً ظل نبوی یا مہدیِ موعود سمجھتے تھے، لیکن ان کا یہ کہنا عقیدۂ "خاتم النبیین" کے منافی نہیں کیونکہ جس نبوت کو وہ آخری نبوت سمجھتے تھے، اس کا انھوں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا اور جس ظلی ملکۂ نبوت کا حامل وہ اپنے آپ کو کہتے تھے، وہ کوئی نئی چیز نہیں۔ رسول اللہ نے خود اپنی امت کے علماء کو انبیاء بنی اسرائیل ظاہر کیا ہے اور مرزا صاحب یقیناً امتِ محمدی ہی سے تعلق رکھتے تھے۔

مرزا صاحب کے دعاوی میں اہم ترین دعویٰ یہی ہے کہ وہ مجدد تھے، سایۂ نبوی تھے، مہدی موعود تھے، لیکن ان سب کا مفہوم ایک ہی تھا، یعنی یہ کہ وہ احیاء دین کے لئے مامور ہوئے تھے اور اس میں کلام نہیں کہ انھوں نے یقیناً اخلاق اسلامی کو دوبارہ زندہ کیا اور ایک ایسی جماعت پیدا کرکے دکھادی، جس کی زندگی کو ہم یقیناً "اسوۂ نبوی" کا پرتو کہہ سکتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو مہبط وحی و الہام بھی کہتے تھے، بظاہر یہ الفاظ بہت خطرناک نظر آتے ہیں لیکن اس مسئلہ پر نگار میں ہم بحوالۂ آیات قرآنی کافی تفصیل کے ساتھ ظاہر کرچکے ہیں کہ وحی و الہام انبیاء کے لئے مخصوص نہیں اس میں حیوانات بھی شامل ہیں یہاں تک کہ نہ صرف تقویٰ بلکہ فسق و فجور کے میلان کو بھی الہام ہی سے تعبیر کیا گیا ہے (فالہمہا فجورہا و تقوٰہا)

اب رہا یہ امر کہ مرزا صاحب واقعی مہبط الہام تھے یا نہیں اور ان کے الہامات کیا اور کیسے ہوتے تھے، یہ ایک مستقل

موضوع ہے جس پر ہم آیندہ کسی وقت تفصیلی گفتگو کریں گے۔

ناسخ و منسوخ اور وفات عیسیٰ کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ہمارے بعض علماء متقدمین کو بھی اتفاق ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ مرزا صاحب نے حالات حاضرہ کے پیش نظر اسے زیادہ زور و قوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

رہا معاملہ مہدی موعود ہونے کا سو اس پر ہمیں آپ کو غور کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ دراصل چیلنج ہے غیر احمدی علماء کے لئے جو خود بھی احادیث و روایات سے ظہور مہدی کا استدلال کرتے ہیں اور مرزا صاحب انھیں احادیث و روایات سے اپنے آپ کو مہدی موعود و مثیل مسیح ثابت کرتے ہیں۔ اس مسئلہ پر بھی مجھے بسیط بحث کرنا ہے۔

یہاں تک تو آپ کے اعتراضات کا جواب تھا، لیکن اب مجھے اس سے ہٹ کر بھی کچھ عرض کرنا ہے وہ یہ کہ آپ اس باب میں خود تحقیق و جستجو سے کام لیجئے، دوسروں کے کہنے پر اعتماد نہ کیجئے۔ اور اگر آپ نے ایسا کیا تو مجھے امید ہے کہ آپ کو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ بانی احمدیت واقعی غیر معمولی فکر و نظر رکھنے والا انسان تھا اور قدرت کی طرف سے ایک خاص ذہنی قوت لے کر آیا تھا، جس نے ہر ہر قدم پر اس کی رہبری کی اور تعمیر اخلاق و کردار ایک بڑی یادگار اپنے بعد چھوڑ گیا۔

می گویم و بعد از من گویند بدستانہا

مکتبۂ جدید لاہور کی مشہور تاریخی، سوانحی اور نفسیاتی مطبوعات

جو ظاہری و معنوی حیثیتوں سے معیاری درجہ رکھتی ہیں۔ آپ ہندوستان میں ہمارے ذریعہ سے حاصل کر سکتے ہیں۔ ذیل کی فہرست ملاحظہ فرمائیے اور آپ کو جو کتابیں درکار ہوں اُن کی قیمت مع محصول ڈاک ذریعۂ منی آرڈر ہمارے پاس بھیجدیجئے (کمیشن وی پی کا کوئی سوال نہیں) لیکن کوئی آرڈر دس روپے سے کم کا نہ ہونا چاہئے جس کے ساتھ محصول ڈاک بحساب پندرہ فی صدی آپ کو بھیجنا چاہئے۔ مینجر نگار لکھنؤ

حیاتِ محمدؐ	(محمد حسین ہیکل)	اٹھارہ روپے	
ابوبکر صدیق	(" ")	دس روپے	
الحسین	(" ")	ڈھائی روپیہ	
الزہرا	(" ")	دو روپیہ	
الہارون	(" ")	پانچ روپیہ	
خالد سیف اللہ	(ابوزید شلبی)	پانچ روپیہ	
عمرو بن العاص	(حسن ابراہیم حسن)	پانچ روپیہ	
چنگیز خاں	(ہیرلڈ لیمپ)	پانچ روپیہ	
امیر تیمور	(" ")	سات روپیہ	
جینے کا قرینہ	(آندرے موروا)	چھ روپیہ	
پریشان ہونا چھوڑئے	(ڈیلی کارنیگی)	چھ روپیہ	
میٹھے بول میں جادو ہے	(" ")	سات روپیہ	
جینے کی اہمیت	(لین یوتانگ)	بارہ روپیہ	
زندگی کا راستہ	(یوس ہیٹس چیبر)	چھ روپیہ	
کامیابی کا راستہ	(" ")	چار روپیہ	
اپنا راستہ خود بناؤ	(خالق کامراں)	چار روپیہ	
کیا آپ کاروبار کرتے ہیں	(اعجاز حسین)	پانچ روپیہ	
ولی سے اقبال تک	(سید عبداللہ)	پانچ روپیہ	
انسان اور آدمی	(محمد حسن عسکری)	چار روپیہ	
مقدمۂ شعر و شاعری	(ڈاکٹر وحید قریشی)	دس روپیہ	
تذکرۂ شوق	(عطاء اللہ مالوی)	چھ روپیہ	
میر حسن اور انکے خاندان کے شعراء	(محمود فاروقی)	پانچ روپیہ	
پھندنے	(سعادت حسین منٹو)	پانچ روپیہ	
گنجے فرشتے	(" ")	پانچ روپیہ	
ٹھنڈا گوشت	(" ")	تین روپیہ	
چغد	(" ")	تین روپیہ	

عہدِ عباسیہ کا دورِ زریں

اور

خواتینِ عرب کا ذوقِ ادب

مامون الرشید، جسے خاندان عباسیہ کا گل سرسبد کہنا چاہئے۔ اپنی تمام انسانی و شاہانہ خصوصیات کے لحاظ سے، جید اعدیم النظیر اور فقید المثال خلیفہ گزرا ہے اس کا حال ہر اُس شخص پر روشن ہے، جس نے سرسری نگاہ سے بھی اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کی مجالس فضل و کمال، اس کی سطوت شاہانہ، اس کی ہنر پروری، اسکی علم نوازی اور اس کی حیات شعری کے حسین مناظر اسی کے ساتھ ختم ہو گئے، اور ایسا ہونا چاہئے تھا، کیونکہ عہدِ عباسیہ کا دورِ زریں جسکی ابتدا ہارون الرشید نے کی تھی اس قدر سرعت کے ساتھ تکمیل حسن کے مناظر پیش کر رہا تھا اور مامون الرشید نے انھیں اس نقطۂ عروج پر پہونچا دیا تھا کہ دوسرے آنے والے خلیفہ کے لئے اس میں کسی اضافہ کرنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہگئی تھی

مامون الرشید کا، اپنے وزیر حسن بن سہل کی لڑکی بوران سے شادی کرنے کا واقعہ، ہر مورخ نے بیان کیا ہے اور جس شوکت و اہتمام کے ساتھ، اقتران عمل میں آیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ مامون میں مسلمانوں کی دولت اور ان کی معاشرت کس قدر ترقی کر گئی تھی، لیکن سب سے زیادہ دلچسپ و غریب واقعہ وہ ہے، جسے دربار مامون کے مشہور مغنی اسحاق موصلی نے بیان کیا ہے اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مامون نے بوران کو کب اور کیونکر دیکھا۔

اس واقعہ کو صاحب عقد الفرید اور ابو الفرج اصفہانی صاحب الاغانی نے نہایت اہتمام سے بیان کیا ہے اور ابن خلدون نے اس کی تردید کی ہے، ظاہر ہے کہ ابن خلدون کی مورخانہ تنقید کے مقابلہ میں عقد الفرید یا الاغانی کی روایت کو صحیح نہیں کہا جا سکتا لیکن اسحاق کی اس روایت سے کم از کم یہ ضرور پایۂ تحقیق کو پہونچتا ہے کہ اس وقت کی حیات اجتماعیہ کا کیا رنگ تھا، اس وقت کی معاشرت کیسی تھی اور نیز یہ کہ اس عہد میں عورتوں کی مجالس ادب کیسی رنگین، کیسی فاضلانہ اور اسی کے ساتھ کیسی عفیف اور اچھوتی ہوا کرتی تھیں، امید ہے کہ ناظرین اس کو دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے

اسحاق موصلی کا بیان ہے کہ ایک دن میں خلیفہ مامون کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور خلیفہ بہت مسرور شاداں نظر آرہا تھا۔ فجأۃ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:۔ "اے اسحاق آج کا دن لطف و مسرت کا دن ہے"۔ میں نے عرض کیا "اے امیر المومنین، خدا اس عیش و مسرت کو مبارک کرے اور دوام بخشے"۔

اس کے بعد خلیفہ نے غلاموں سے مخاطب ہو کر کہا کہ:۔ "دروازہ بند کرو اور شراب لاؤ"۔ یہ کہکر خلیفہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور دوسرے کمرہ میں لے گیا جہاں تمام ضروری اسباب تفریح موجود تھے، یہاں کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب دور شراب شروع ہوا تو چاروں طرف سے حسین و جمیل کنیزیں مختلف قسم کے ساز موسیقی لے کر نمودار ہوئیں اور یہ محفل نشاط شام تک برپا رہی، جب آفتاب غروب ہوا تو خلیفہ نے

مجھ سے کہا "اے اسحاق جوانی کے بہترین ایام وہی ہیں جو عیش و طرب میں بسر ہو جائیں"۔ میں نے جواب دیا "امیر المومنین کا ارشاد بالکل درست ہے"۔ اس کے بعد خلیفہ بولا کہ "میں چاہتا ہوں کہ یہ رات بھی اسی لطف میں بسر ہو جائے اور اب میں حرم میں جانا چاہتا ہوں، تم یہیں رہو میں تمھیں جلد یاد کر لوں گا"۔ یہ سُن کر میں نے سر اطاعت خم کر دیا اور خلیفہ اُٹھ کر دار السلام میں داخل ہو گیا۔

اسحاق کا بیان ہے کہ جب رات زیادہ گزر گئی اور مجھے یاد نہ کیا گیا، تو میں سمجھا کہ خلیفہ مجھے بھول گیا اور میں گھر جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا، خدام نے پوچھا تو میں نے کہدیا کہ "خلیفہ اس وقت عیش و عشرت میں منہمک ہے، مجھے کیوں یاد کرنے لگا، علاوہ اسکے وقت بھی گزر گیا ہے اور وہ اب مجھے نہ بلائے گا"۔ یہ کہکر میں دروازہ سے نکلا تو حاجبوں نے کہا کہ "آپ کے غلام سواری لے کر آئے تھے لیکن جب زیادہ دیر ہو گئی تو واپس گئے، اگر حکم ہو تو خاصہ کی سواری منگوائی جائے"۔ میں نے کہا "کوئی حرج نہیں، پیادہ چلا جاؤنگا" انھوں نے مشعل لانے کو کہا میں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔

میں راستہ سے گزر رہا تھا کہ مجھے حاجت محسوس ہوئی، اس لئے اس گلی میں ہو گیا وہاں دیکھا کہ کوئی چیز ایک مکان کی دیوار سے لٹکی ہوئی ہے لٹک رہی ہے، میں نے قریب جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک زنبیل ہے جس میں چار قبضے دیباج سے منڈھے ہوئے لگے ہوئے ہیں اور اُن میں چار ریشمی ڈوریں بندھی ہوئی ہیں۔ میں دیر تک اس پر غور کرتا رہا اور آخر کار جسارت سے کام لے کر اس زنبیل میں بیٹھ گیا، میرا زنبیل میں بیٹھنا تھا کہ اس میں حرکت پیدا ہوئی اور میں اُوپر کی طرف چلا، لب بام پہونچ کر میں نے دیکھا کہ چار کنیزیں کھڑی ہوئی ہیں۔ انھوں نے دریافت کیا کہ "تم واقف الحال ہو یا نئے آدمی" میں نے کہا کہ "میں تو نیا آدمی ہوں"۔ یہ سُن کر انھوں نے ایک اور کنیز کو آواز دی کہ "شمع لاؤ"۔

جب میں مکان میں داخل ہوا، تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی، کہ سوائے حسن و لطافت کے کوئی اور چیز نظر نہ آتی تھی۔ نہایت مکلف فرش بچھا ہوا تھا، جا بجا مسندیں آراستہ تھیں، اور یہ تمام سامان اس قدر قیمتی تھا کہ سوائے دار الخلافت کے کہیں اور پایا نہیں جا سکتا تھا، میں وہاں سب سے ادنیٰ جگہ بیٹھ گیا، اس کے بعد دفعتاً مکان کے ہر چہار طرف سے ہنگامۂ حیات کے آثار نمودار ہونے لگے اور حسین و جمیل کنیزوں کی آمد شروع ہوئی، جن میں سے بعض کے ہاتھ میں شمعیں تھیں اور بعض مجمرے لئے ہوئے تھیں جن سے عود و مشک کی خوشبو بلند ہو رہی تھی، انھیں کنیزوں کے درمیان ایک نوجوان لڑکی، جو عاج کا مجسمہ معلوم ہوتی تھی، مستانہ وار جھومتی چلی آتی تھی میں اس کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا، اس نے بڑھ کر میرا خیر مقدم ادا کیا اور دریافت کیا کہ میں کیسے خیر متوقع طور پر یہاں پہونچ گیا میں نے جواب دیا کہ "میں اپنے بعض احباب کے پاس سے تنگ وقت میں اُٹھ کر چلا تو اس راستہ سے گزرنا ہو گیا، میں نے ایک زنبیل خلق دیکھی، چونکہ نیند کے نشہ سے چور تھا اس لئے اس زنبیل میں بیٹھ گیا، اگر یہ غلطی تھی تو خصور نیند کا تھا اور اگر غلطی نہ تھی تو خدا کی طرف سے الہام تھا"۔ اس نے کہا "کوئی حرج نہیں، لیکن یہ تو بتایئے کہ آپ کا پیشہ کیا ہے"۔ جواب دیا کہ "میں بزاز ہوں" اسنے پوچھا "کس طبقہ سے آپ کا تعلق ہے؟" میں نے کہا "طبقۂ اوسط سے"۔ اس نے کہا کہ "اگر کچھ اشعار یاد ہوں سُنایئے"۔ میں نے کہا: "کچھ تو یاد ہیں، لیکن اجنبی ہوں اور وحشت میں مبتلا، پہلے آپ شروع کیجئے تاکہ میری وحشت دور ہو"۔

اس کے بعد اس نے قدیم و جدید شعراء کا کلام اور اُن کے بہترین اقوال سنانے شروع کئے میں حیران تھا کہ اُس کے حافظہ کی داد دوں یا حسن انتخاب کی، اس کے ادا کرنے کی خوبی کو سراہوں، یا اس کے اوزان شعر کی معرفت کو، جب وہ اس سے فارغ ہوئی تو مجھ سے اصرار کیا اور میں نے بھی مختلف شعراء کے اشعار اور دلچسپ حکایات و واقعات سنائے جس سے وہ بہت مسرور ہوئی اور بولی کہ: "طبقہ تجار میں کس کا ایسا صاحب علم و معرفت ہونا تعجب انگیز ہے"۔ میں نے کہا کہ "مجھے ان چیزوں کے مطالعہ کا موقع مل گیا تھا، اس لئے کچھ دماغ میں محفوظ رہ گیا"۔

اس کے بعد دسترخوان بچھا اور نہایت ہی لطیف اور پاکیزہ کھانے چنے گئے، میں کھاتا جاتا تھا اور اس کے ذوق کی پاکیزگی

اور حسنِ ادب پر حیرت کر رہا تھا، کھانے کے بعد نبیذ کا سامان لایا گیا، میرے سامنے ایک صینی میں بلوری جام و مینا رکھ دیا گیا وسط مجلس میں پھولوں کے گلدستے رکھ دئے گئے اور عجیب و غریب میوے چنے گئے، یہ تمام سامان اس قسم کا تھا کہ سوائے خلیفہ اور اس کے ولی عہد کے کہیں اور میسر نہ آسکتا تھا۔

وہ بولی کہ "اب وقت تفریح و گفتگو کا ہے کچھ کہئے"۔ میں نے نہایت دلچسپ تاریخی واقعات سنائے جن کو سن کر وہ بہت مسرور ہوئی اور بولی کہ "طبقۂ تجار میں ایسے قابل افراد کا پایا جانا عجیب بات ہے"۔ میں نے کہا کہ "میرا ایک پڑوسی بعض ملوک کا ندیم رہا ہے، اوقات فرصت اسی کے پاس بسر ہوتے تھے، اس لئے مجھے بھی سلیقہ گفتگو کا حاصل ہو گیا"۔

اس کے بعد دورِ شراب شروع ہوا۔ باتیں ہوتی جاتی تھیں، نبیذ کے دور چل رہے تھے اور رات اس لطف میں گزر رہی تھی کہ وہ بولی:۔ "میں تمھیں ہر بات میں کامل پاتی ہوں لیکن صرف ایک موسیقی کی کمی ہے، اگر اس سے آگاہی ہو تو کیا کہنا"۔ میں نے جواب دیا کہ "مجھے کسی وقت اس کا بڑا شوق تھا، اور کوشش بھی سیکھنے کی کی، لیکن جب میں اس میں کوئی ترقی نہ کر سکا تو چھوڑ دیا لیکن سننے کا مشتاق بہت ہوں"۔ یہ سن کر اس نے عود منگایا اور گانا شروع کیا، اس کی موسیقی کا اثر مجھ پر ایسا ہوا کہ میں سارے مکان پر وجد کی سی کیفیت محسوس کرتا تھا، وہ ہر چیز نہایت باقاعدہ اور پوری صحت کے ساتھ ادا کرتی"۔ پھر خود ہی اس نے پوچھا کہ:۔ "جانتے ہو یہ کس کا گانا ہے"۔ میں نے کہا "مجھے تو معلوم نہیں" اس نے کہا کہ "یہ اسحاق موصلی کا ہے"۔

الغرض ساری رات اسی لطف میں بسر ہوئی، جب صبح کا وقت ہوا تو ایک ضعیفہ آئی اور اس نے کہا کہ:۔ "اے بیٹی وقت ختم ہو گیا"۔ یہ سن کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھے نہایت تہذیب کے ساتھ رخصت کیا۔

گھر پہونچ کر میں نے نماز پڑھی اور سونا چاہا، لیکن ابھی سر تکیہ ہی پر رکھا ہی تھا کہ خلیفہ کے چوبدار آئے اور مجھے لے گئے۔ میں حاضر ہوا تو خلیفہ نے کہا "اے اسحاق، کیا تم مجھ سے بیزار ہو گئے"۔ میں نے عرض کیا "اے امیر المومنین میرے لئے اس سے زیادہ کیا مسرت ہو سکتی ہے کہ خدمت میں حاضر ہوں لیکن بات یہ ہے کہ میں نے ایک لونڈی خریدی ہے اور اس میں جی لگا رہتا ہے، رات جب امیر المومنین نے مجھے طلب کیا، تو مجھے اس کا خیال آیا اور چلا گیا"۔ یہ سن کر خلیفہ نے پوچھا "کیا کل کی سی صحبت پھر برپا کی جائے"۔ میں نے عرض کیا کہ "اے امیر المومنین ایسی صحبت سے کس کو عذر ہو سکتا ہے"۔

چنانچہ پھر وہی صحبت برپا ہوئی اور خلیفہ پھر مجھے منتظر کر کے حرم میں داخل ہو گیا، میں نے جانا چاہا تو غلاموں نے روکا، مکان میں انھیں مطمئن کر کے پھر زنبیل میں بیٹھ کر اسی مکان میں پہونچا اور ساری رات اسی لطف میں بسر کر کے گھر پہونچ گیا۔

گھر پہونچا ہی تھا کہ خلیفہ کے چوبدار پھر مجھے لے گئے اور خلیفہ مامون آج مجھ پر برہم ہوا۔ میں نے پھر اپنی مجبوری ظاہر کر کے معافی چاہی اور مامون نے معاف کر کے پھر وہی بزم نشاط مرتب کر کے مجھے اس میں شریک کیا اور بعد کو حرم میں داخل ہو گیا لیکن اس مرتبہ سخت تاکید کر دی کہ جانا نہیں۔

میں سمجھتا تھا کہ اس مرتبہ اگر میں نے حکم سے عدول کیا تو خیر نہیں، لیکن اسی کے ساتھ جب گزشتہ دو راتوں کے لطف صحبت کا خیال آتا تھا تو جی تڑپ اٹھتا تھا، آخر کار تمام مصالح کو نظر انداز کر کے حاجیوں اور غلاموں کو سمجھا بجھا کر پھر وہیں پہونچ گیا۔

اس مرتبہ جب رخصت کا وقت آیا تو مجھے خیال آیا کہ اب مامون کو سارے حال سے آگاہ کئے بغیر جان نہیں بچ سکتی تھی اس لئے میں نے اس خاتون سے کہا کہ "میرا ایک عم زاد بھائی ہے اور وہ فنون شعر و ادب کے علاوہ موسیقی کا بھی ماہر ہے اگر اجازت ہو تو کل اسے لیتا آؤں"۔ اس نے نہایت لطف سے اس کی اجازت دیدی اور میں گھر چلا آیا، لیکن ابھی ضروریات سے فارغ نہ ہوا تھا کہ خلیفہ کے آدمی آئے اور مجھے لے گئے، سامنے حاضر ہوا تو روح خشک ہو گئی، کیونکہ آج وہ بہت غضب آلود تھا، میں نے جاتے ہی

عرض کیا کہ "غلام کا ماجرا پہلے خلوت میں سُن لیا جائے اس کے بعد کوئی حکم نافذ کیا جائے"۔ میرے اس کہنے پر خلوت ہو گئی اور میں نے سارا حال مامون الرشید کو سُنایا، مامون سُن کر بہت بیتاب ہوا اور بولا کہ مجھے بھی وہاں لے چلو، میں نے کہا "یہ کیونکر ممکن ہے"۔ اس نے کہا کہ "میں کچھ نہیں جانتا، مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا"۔

آخر کار شام ہوئی اور میں خلیفہ کو لے کر اس گلی میں پہونچا۔ آج بجائے ایک کے دو زنبیلیں معلق تھیں، ہم دونوں بیٹھ کر اوپر پہونچ گئے، مامون نے جب مکان کی آرائش اور وہاں کے سامان کو دیکھا تو حیران رہ گیا کہ یہ کس کا مکان ہو سکتا ہے، میں اپنی جگہ بیٹھ گیا اور مامون کو اپنی مسند سے ذرا نیچے جگہ دی، جب وہ خاتون آئی تو اس نے مامون کو اُٹھا کر صدر میں بٹھایا اس حال میں کہ مامون اس کے حسن سے بالکل مسحور ہو چکا تھا۔

اس کے بعد لطف صحبت شروع ہوا اور وہ مامون کی فاضلانہ و ادیبانہ گفتگو سے بہت مسرور ہوئی اور مجھے وعدہ یاد دلایا میں نے کہا کہ "ہاں یہ بھی سنائیں گے، لیکن پہلے آپ سنائیے"۔ اس نے عود لے کر گانا شروع کیا اور ہم لوگوں نے نبیذ کا شغل جب مامون کا نشہ بڑھ گیا تو دفعتاً بے اختیار ہو کر بول اُٹھا کہ "اے اسحاق" اور وہ مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے شیر اپنے شکار کو دیکھے۔ میں نے کہا "لبیک یا امیر المومنین" اس نے کہا کہ "اس چیز کو تو گا کر سنا"۔ یہ سنتے ہی میں نے عود لے لیا اور وہ خاتون حقیقت حال معلوم کر کے فوراً پردہ میں چلی گئی۔

جب میں گانے سے فارغ ہوا تو خلیفہ نے کہا کہ "دریافت کرو یہ کس کا مکان ہے"۔ میں نے جا کر اُس ضعیفہ سے پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ "حسن بن سہل کا مکان ہے اور یہ خاتون اس کی لڑکی بوران ہے"۔ میں نے آکر خلیفہ سے عرض کیا، خلیفہ نے کہا کہ "اب اس واقعہ کا ذکر تم کسی سے نہ کرنا"۔

جب صبح ہوئی اور حسن بن سہل حاضر ہوا تو مامون نے اس سے کہا کہ "تمہارے کوئی لڑکی ہے"۔ حسن نے جواب دیا:۔ "ہاں، اے امیر المومنین"۔ مامون نے پوچھا "اس کا کیا نام ہے"۔ حسن نے جواب دیا "بوران"۔ مامون نے کہا کہ "میں اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں"۔ حسن بولا کہ "وہ امیر المومنین کی کنیز ہے، مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے"۔ خلیفہ نے کہا کہ "میں ۳۰ ہزار دینار مہر معجل پر اسے اپنے نکاح میں لیتا ہوں" اور اس طرح مامون الرشید کا عقد بوران سے عمل میں آگیا۔

اسحاق موصلی کا بیان ہے کہ میں نے اس واقعہ کو مامون کی زندگی میں کسی سے نہیں کہا اور میں اپنی زندگی کی وہ چار راتیں کبھی نہیں بھول سکتا جو بوران کے مکان پر بسر ہوئیں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس نے یہ فضل و کمال مختلف ادیبوں اور کاملین فن کے فیض صحبت سے حاصل کیا تھا، لیکن اس کی یہ تمام صحبتیں ایسی پاکیزہ ہوتی تھیں کہ کبھی کسی مکروہ بات کا ذکر بھی درمیان میں نہ آتا تھا، یہ معلوم کر کے بوران کی عزت میرے دل میں بہت بڑھ گئی، اور اس کے اس شرف کا میں نے ہمیشہ احترام کیا۔

اگر آپ تاریخی، مذہبی معلومات چاہتے ہیں تو یہ لٹریچر پڑھئے

خدا نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔ تنقیح اسلام نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔ فرمانروایان اسلام نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول
علوم اسلام و علماء اسلام نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔ جوبلی نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔
یہ پانچوں نمبر ایک ساتھ آپ کو معہ محصول بیس روپیہ میں مل سکتے ہیں۔ بشرطیکہ قیمت آپ پیشگی ذریعہ منی آرڈر بھیجدیں۔
منیجر نگار لکھنؤ

کشکول

عرب اور علم طب

زمانۂ جاہلیت میں بھی اہل عرب فن طب اور علم الکیمیاء کے ماہر تھے اور یہ فن سحر کی قسم میں داخل سمجھا جاتا تھا، جیسا کہ لفظ طب کے معنے سے ظاہر ہے۔

جب عمرو بن العاص نے مصر فتح کیا تو اسکندریہ کے کتب خانہ میں جالینوس کا تالیف کیا ہوا ایک مجموعۂ طب موجود تھا اور اسکندریہ کا وہ مشہور طبیب (اہرون) بھی زندہ تھا جس نے جالینوس کی کتابوں کا ترجمہ سریانی میں کیا تھا، بعد کو یہی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں۔

خلفاء عباسیہ کے دربار میں عرب و شام کے اطباء کثرت سے پائے جاتے تھے، خلفاء اس وقت تک جسم انسانی کی تشریح کی اجازت نہ دیتے تھے جب تک بختیشوع اور حنین بن اسحاق کی رائے نہ طلب کر لی جاتی، مقتدر یا بعد کے زمانہ میں ۸۶۰ اطباء موجود تھے، اور خلیفۂ متوکل کے پاس ہر وقت ۵۶ مسیحی اطباء موجود رہتے تھے، کہا جاتا ہے کہ سیف الدولہ اس وقت کھانا نہ کھاتا تھا، جب تک ۲۶ اطباء اس کے ساتھ نہ ہوتے۔

اس محکمہ کا اس وقت باقاعدہ نظام قایم تھا اور تمام اطباء دربار کا ایک افسر ہوا کرتا تھا جو تمام اپنے ماتحت طبیبوں کا امتحان لیا کرتا تھا، ان میں سے سنان بن ثابت بغداد میں اور مہذب الدین الاخوار مصر میں بہت مشہور تھے۔

قرابادین کی تالیف سب سے پہلے عربوں ہی نے کی اور شفاخانے، دواخانے بھی انھوں ہی نے اول اول قایم کئے چنانچہ ان کے بعض اصطلاحیں اب تک مغربی زبانوں میں رائج ہیں۔ مثلاً لعوق، رب، غول، تریاق وغیرہ، گولیوں پر سونے چاندی کے ورق چڑھانا بھی انھیں کی ایجاد ہے۔

یہ لوگ بہت سے کیمیائی مرکبات سے واقف تھے، چنانچہ ماء الفضہ، زیت القراح، سلیمانی، پوتاس، روح نوشادر، حجر جہنم، راسب الاحمر، ملح البارود، زاج اخضر، بورق اور زرنیخ وغیرہ انھیں کی ایجاد ہیں۔

یہ لوگ تقطیر[1]، تریشح[2]، تصعید[3]، تبلور[4] سے بھی آگاہ تھے اور خواص سے بھی پوری طرح واقفیت رکھتے تھے۔

حرارت آفتاب کی پیمایش

امریکہ سے ایک راکٹ روانہ ہونے والا ہے جو نصف کرۂ ارض کا دورہ کر کے روزانہ مختلف مقامات پر حرارت آفتاب کی پیمایش کرے گا اس کے لئے ایک آلہ ریڈیو میٹر بنایا گیا ہے، جس کی حس اس قدر تیز ہے کہ، ہزار فٹ کے فاصلہ سے ایک شمع کی روشنی اس کی حرارت پیمائی کو سیکڑوں درجہ تک آگے بڑھا دیتا ہے، اتنے ہی فاصلہ سے ایک انسانی چہرہ کی چمک بھی ۲۵ درجہ تک سوئی کو بڑھا دیتی ہے

---

[1] Distillation. [2] Filteration.
[3] Volatiligation. [4] Crystaligation

زمین کی عمر علمار طبقات الارض ذرّوں کے انفجار (Explosion of atoms .) اور اجزاء یورینیم کے سیسہ میں تبدیل ہو جانے سے زمین کی عمر کا اندازہ کرتے ہیں، چنانچہ پروفیسر لین نے اس حساب سے زمین کی عمر ..... ۱۲۵ سال بتائی ہے۔

اختراعات چین بعض صنعتیں ایسی ہیں جن کو اہل چین نے اختراع لیا، لیکن بعد کو انھیں بھول گئے اور پھر دوبارہ مغرب سے حاصل کیا، مثلاً قطب نما کہ اسے اہل چین ہی نے ۱۱۱۲ء میں ایجاد کیا تھا یا کاغذ کہ پہلی صدی عیسوی میں یہ لوگ عام طور پر بناتے تھے، یا کانچ، یہ بھی دوسری میں ان کے یہاں عام تھا۔

وہ آلہ جو زلزلہ کی آمد کا پتہ دیتا ہے اسے بھی پہلی صدی میں اہل چین نے بنایا تھا۔ بارود کا علم انھیں یورپ سے پہلے حاصل تھا ریشم کی صنعت بھی اب سے دو ہزار سال قبل ان کے ہاں عام تھی، لیکن بعد کو یہ تمام صنعتیں انھوں نے بھلا دیں اور اب پھر یورپ سے سیکھ رہے ہیں۔

آواز کے عجائب جس وقت فوج پل پر سے گزرتی ہے تو قدم آہستہ کر دئے جاتے ہیں اور باجہ بند، کیونکہ بارہا ایسا ہوا کہ فوج پل پر سے اپنی معمولی رفتار کے ساتھ باجہ بجاتی ہوئی گزری اور پل ٹوٹ گیا یا شق ہو گیا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ موسیقی کے اہتزازات سے جو صدا پیدا ہوتی ہے وہ پل کی بنیادوں میں نفوذ کر جاتی ہے اور اندر سے اس کی ساخت میں ڈھیلاپن پیدا کر دیتی ہے۔

آواز کے عجائب اور دوسری طرح بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ مثلاً سارنگی کی آواز سے دور رکھے ہوئے گلاس کا ٹوٹ جانا یا محض پنڈولم (رقاص) کی جنبش سے مکان کا منہدم ہو جانا، چونکہ بعض دفعہ آواز کے اہتزازات کی تعداد ایک سکنڈ میں ہزار تک پہنچ جاتی ہے اس لئے اس نوع کے اثرات حیرت انگیز نہیں۔

قمار بازی کی انتہا دُنیا میں چین سے زیادہ شائق قمار بازی کا اور کوئی ملک نہیں تھا۔ جب کوئی چینی قمار باز جوا کھیلنے بیٹھ جاتا تو ساری دُنیا اُسے ہیچ نظر آنے لگتی۔ جب وہ سب کچھ ہار جاتا تو اپنے سر کی چوٹی بازی میں لگا دیتا (جسے وہ نہایت عزیز سمجھتا ہے)۔ جب وہ چوٹی بھی ہار جاتا تو اُسے منڈا دیتا اور فریق غالب اس پر قبضہ کر لیتا۔

بعض دفعہ اُنگلیاں ہار جاتے اور کاٹ کر فریق مخالف کو دیدیتے، جب اُنگلی قطع کی جاتی تو ہارنے والا اپنا ہاتھ کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیتا تاکہ خون بند ہو جائے۔

ایک عرب طبیب کی ذہانت عضد الدولہ نے اپنے دربار کے طبیب کو بلا کر حکم دیا کہ کسی مناسب جگہ شفاخانہ تعمیر کیا جائے جہاں کی آب و ہوا مفید صحت ہو، اس نے گوشت کا ٹکڑا لے کر اس کے چار حصے کئے اور شہر سے باہر چار مختلف مقاموں میں ایک ایک ٹکڑا رکھوا کر وہاں آدمی متعین کر دئے تاکہ اس میں عفونت پیدا ہونے کا وقت اچھی طرح دیکھ لیں، جب نتیجہ معلوم ہو گیا تو اس نے اس جگہ شفاخانہ تعمیر کرا دیا جہاں گوشت کا ٹکڑا سب سے بعد میں سڑنا شروع ہوا تھا، کیونکہ یہاں مہلک جراثیم کا کم ہونا اس طرح ثابت ہو گیا تھا۔

اقوال و امثال

افسوس ہے اس قوم پر جس کی سیاست مکاری ہے جس کا فلسفہ شعبدہ بازی ہے اور جسکی صناعت دوسروں کو احمق بنانا۔ (جبران خلیل)

افسوس ہے اُس قوم پر جو پہونچتی ہے وہ چیز جسے وہ نہیں بنتی اور کھاتی ہے وہ چیز جس کو وہ نہیں بوتی۔ (جبران خلیل)

افسوس ہے اس قوم پر جس کے عقلاء تو گونگے ہیں اور قوی اندھے، لیکن اس کے حیلہ باز افراد بول رہے ہیں۔ (" ")

افسوس ہے اس قوم پر جس کا ہر گروہ ایک قوم ہے۔ (" ")

سب سے پہلے

جس نے عربی حروف پر نقطے لگائے _____ نصر بن عاصم تھا

جس نے درہم و دینار چلائے _____ عبدالملک بن مروان تھا

جس نے سیاسی مجلس کا نام پارلیمنٹ رکھا _____ انگریز ہیں

جس نے دواسازی کی دوکانیں قایم کیں _____ اہلِ عرب ہیں

جس نے خدیو کا لقب اختیار کیا _____ اسماعیل پاشا تھا

کیا اور کیوں

۱- سر پر ضرب پہونچنے سے تارے کیوں نظر آنے لگتے ہیں ؟ _____ اس لئے کہ دماغ جب اعصاب بصر سے حرکت حاصل کرتا ہے تو اسے روشنی کی صورت میں محسوس کرتا ہے اور چونکہ سر کی ضرب سے اعصاب بصر میں زیادہ حرکت پیدا ہوتی ہے اس لئے دماغ بھی اس سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور اُس تاثر کو وہ مشعلہ یا تاروں کی صورت میں محسوس کرتا ہے۔

۲- سبز رنگ کے پھول کیوں اس قدر کمیاب ہیں ؟ _____ اس لئے کہ فطرت نے پھولوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ کیڑوں کو اپنی طرف متوجہ کریں، اور چونکہ درختوں کا رنگ اکثر سبز ہوتا ہے اس لئے اگر پھول بھی اسی رنگ کے ہوتے تو جاذبیت پیدا نہ ہوتی، اختلاف رنگ سے کیڑے اس طرف کھنچتے ہیں۔

۳- بعض صابون پانی میں کیوں تیرتے ہیں ؟ _____ اس لئے کہ بنانے کے وقت ان کے اندر بہت سے بلبلے رہ گئے ہیں جن میں ہوا بھری ہوئی ہے اور وہ صابون کو ڈوبنے نہیں دیتی۔

۴- اگر کوئی شخص جلدی جلدی گائے یا سرعت کے ساتھ باجا بجائے تو ہم اپنے کو کیوں زیادہ ہوشیار و آمادۂ عمل محسوس کرتے ہیں ؟ _____ اس لئے کہ قلب ہر موزوں چیز کا ساتھ دیتا ہے۔ قلب کی حرکت ۷۰ فی منٹ ہے۔ اگر کسی موزوں آواز کا نشیب و فراز اس سے زیادہ تیز ہوتا ہے تو قلب بھی اس کا ساتھ دینے کے لئے اپنی حرکت تیز کر دیتا ہے اور اس طرح خون کا دورہ سریع ہو جاتا ہے۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ

گرین لینڈ کے قریب چار چار سو سال کی مچھلی پائی جاتی ہے

مکڑی بغیر غذا کے دس مہینے زندگی بسر کرتی ہے۔

آستانہ میں دو ہزار مساجد ہیں جن میں سب سے زیادہ حسین جامع سلطان احمد ہے اس میں چھ جگہ اذان دی جاتی ہے۔

زمین کے اندر آفتاب کی حرارت ۶۰ فٹ سے زیادہ نہیں پہونچتی۔

کوئی صدی جمعہ، سنیچر اور بدھ کے دن سے شروع نہیں ہوتی۔

ساری دُنیا کے ساحلوں کی مجموعی پیمایش ۱۲۶۰۰۰ میل ہے۔

بجلی کی رفتار ۱۸۸۰۰۰ میل فی سکنڈ سے کم نہیں ہے۔

دُنیا کی سب سے زیادہ مشکل زبان چینی اور اس کے بعد عربی ہے۔

دُنیا کا سب سے بڑا پُل وہ ہے جو امریکہ میں سمندر کے ایک حصّہ پر بنایا گیا ہے، اس کا طول ۲۰ میل ہے اور بالکل لکڑی کا بنا ہوا ہے۔

ریل کے ٹھہرانے کے لئے بہ نسبت چلانے کے دو چند قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔

جڑے جس قدر مضبوط اور بڑے ہوں گے دماغ اتنا ہی چھوٹا ہوگا

سب سے پہلی کشتی میں چپو کا استعمال فینقیا والوں نے کیا۔

دُنیا میں ۸۰ ہزار سے زاید قسمیں کیڑے مکوڑوں کی ہیں۔

اگر دُنیا کی آبادی برابر بڑھتی جائے اور کوئی ہلاک نہ ہو تو ۱۹۳۰ء میں ۷ کھرب ہو جائے، حالانکہ اس وقت صرف ایک ارب ۷۰ کروڑ ہے

گھوڑے ۲۵ دن تک بغیر کھائے پیئے زندہ رہ سکتے ہیں۔

شاہ سیام کا باڈی گارڈ ۴۰۰ جوان لڑکیوں پر مشتمل ہے جس میں ملک کی حسین ترین اور نہایت قوی لڑکیاں داخل ہو سکتی ہیں۔

دُنیا کی آبادی میں ۳۰۰۴ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اور تقریباً ایک ہزار مذاہب جاری ہیں۔

چوپایہ جانوروں میں اونٹ ہی ایک ایسا جانور ہے جو تیرنا نہیں جانتا۔

اہلِ انگلستان سال میں اتنی شراب پی لیتے ہیں کہ اگر وہ جمع کی جائے تو انگلستان کے سارے جہاز اس میں تیر سکتے ہیں۔

اس وقت دُنیا کا سب سے زیادہ قدیم شہر دمشق ہے

ایک اونس مکڑی کے جالے کو اگر پھیلایا جائے تو اس کا طول ۳۵۰ میل سے کم نہیں ہوگا۔

کیکڑا اپنی غذا کو پاؤں سے چباتا ہے۔

سلگتے بادل

(پروفیسر) شورؔ علیگ

پھر ہمالہ کے سینے میں ڈوبی کرن
پھر اندھیروں کے اُڑتے ہوئے شہر میں
برق پھر اپنا گھونگھٹ اُلٹنے لگی
صبح میں پھر شبِ تار گھلنے لگی،
دھوپ میں دوپہر کی جھلستے کسان
ہر نظر دل کی آواز سننے لگی
پھر نگاہوں میں ہندوستاں پھر گیا،
جانبِ بتکدہ پھر پجاری چلے
گرم پھر بزمِ چنگ و چغانہ ہوئی
دامنِ کوہ صحرا کے بھیگے غزال
پھر سردی سے فضاؤں میں آنچل ڈھلے
دام بر دوش پھر آہوانِ حرم
بھیگے پلکوں کہیں بارِ محرم ہوئے
سرمئے پانک شفق میں نہاتے شباب
ہیکلِ بھیتی دیوتاں کے ترشے صنم
کالی راتوں میں صبحوں کے پیغامبر
جھانکنے پھر لگے بام سے آفتاب
پھر کسی کی ملاقات سے پیشتر
پھر کسی کو سنا کر غزل پر غزل
پھر زمانے سے نظریں بچاتے ہوئے
بتکدے کے طواف شب و روز پر
کچھ برہمن ہوئے شہر کے کینہ ساز
اُس گلی سے گزرتا ہوا پھر حرم
ہم کہ ہے وجہ گھر سے نکلتے نہ تھے

پھر پسینے گھٹاؤں کو آنے لگے
ابر بجلی کے دیپک جلانے لگے
بادل اپنی طرف پھر بلانے لگے
ظلمتوں میں اُجالے نہانے لگے
نم ہواؤں کے سازوں پہ گانے لگے
ہر نفس تار سے تھرتھرانے لگے
پھر تصور میں کچھ لوگ آنے لگے
پھر برہمن جلا جل بجانے لگے
پھر دھواں دل سے مطلع اٹھانے لگے
دشت سے پھر سوئے سہر آنے لگے
تشنے ماتھوں پہ پھر جگمگانے لگے
شہر کی عید گاہوں میں آنے لگے
سرد بازو کہیں کپکپانے لگے
خواب مقروِ عجم کے دکھانے لگے
دیپ دیر و حرم کے بجھانے لگے
بھیگے شانوں پہ گیسو سکھانے لگے
بھر دریچوں میں مہتاب آنے لگے
ربط ماحول سے ہم بڑھانے لگے
اپنے تیر آپ سینے پہ کھانے لگے
ہم سوئے بتکدہ آنے جانے لگے
اُنگلیاں اہل کعبہ اُٹھانے لگے
کچھ مسلماں خدا سے ڈرانے لگے
ہاتھ پھر ہم دُعا کو اُٹھانے لگے
ٹھوکریں رہگزاروں کی کھانے لگے

یہ فسانہ جو ہم شامِ غم چھیڑ دیں
نیند سی چاند تاروں کو آنے لگے!

انتخابِ کلام یکتا بھوپالی (مرحوم)

یکتا بھوپالی ان شعراء میں سے تھے جو اپنے عہد کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا زمانہ غالباً داغ و امیر کا زمانہ تھا اور انھیں کے رنگ میں وہ بھی شعر کہتے تھے۔ یکتا نے غزلوں کا کافی ذخیرہ اپنے بعد چھوڑا، لیکن وہ غالباً منتشر حالت میں ہے۔

ان کی چند غزلیں بھوپال کے ایک پروفیسر نے مجھے بھیجدی تھیں اور ذیل کے اشعار انھیں غزلوں کا انتخاب ہے۔ (نیاز)

اِس سادگی سے اس نے یہ پوچھا کہ کیا ہوا
حیرت سے رہ گیا کوئی منھ دیکھتا ہوا

دیر و حرم کی قید نہیں راہِ عشق میں،
سر جھک گیا جہاں وہیں سجدہ ادا ہوا

انجان بن کے پاس سے کوئی گزر گیا
نیچی نظر سے دل کی طرف دیکھتا ہوا

اِدھر دشواریاں راہِ طلب کی بڑھتی جاتی ہیں
اُدھر دل کو یقینِ قربِ منزل ہوتا جاتا ہے

لگا دیں لاؤ خود ہی آگ اپنے آشیانے میں
بہر صورت بچانا بجلیوں سے ہے گلستاں کو

جدا ہو کر چمن سے ہم قفس تک اس طرح پہونچے
ہزاروں مرتبہ مڑ مڑ کے دیکھا ہے گلستاں کو

کمالِ عشق نے پہونچا دیا کہاں مجھ کو،
کہ آج دل پہ ہے کچھ اور ہی گماں مجھ کو

دیوانہ کہہ رہے ہیں مجھے وہ بھی غیر بھی
جو کچھ میں سن رہا ہوں حقیقت نہ ہو کہیں

وارفتگیٔ شوق میں اللہ رے بے خودی
میں کہہ رہا ہوں کچھ مجھے کہنا کچھ اور ہے

ساحل کی آرزو ہے تو موجوں میں ڈوب جا
اس بحرِ بیکراں کا کنارہ کچھ اور ہے

سب سے الگ ہے عشق و محبت کی سرزمیں
یکتا دلِ تباہ کی دنیا کچھ اور ہے

اک حال پر رہا نہ کبھی حسنِ ماسوا
ہم عمر بھر یہ شام و سحر دیکھتے رہے

ہر شے حریمِ ناز کی تھی جاذبِ نظر
اُٹھی جدھر نگاہ ادھر دیکھتے رہے

اس انجمن میں یہ بھی نہ محسوس کر سکے
کس پر پڑی نگاہ کدھر دیکھتے رہے

یکتا وہ آئے اور چلے بھی گئے مگر
ہم بیخودی میں جانبِ در دیکھتے رہے

مجھے دردِ جگر میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے
خدا رکھے کوئی تازہ مصیبت دل پہ آئی ہے

بہر عنواں سنا تو دی ہے دل کی داستاں یکتا
اگر سمجھیں تو سب کچھ ہے نہ سمجھیں تو کہانی ہے

یہ بھی دنیائے محبت کا عجب دستور ہے
رونے والا مسکرانے کے لئے مجبور ہے

ہو گئی برہم نظامِ دل کی ساری کائنات
اُن نگاہِ ملتفت اب اور کیا منظور ہے

اہلِ محفل یہ سمجھتے ہیں کہ میں منزل پہ ہوں
اور شوقِ جستجو کہتا ہے منزل دور ہے

آہنگِ شب

(پروفیسر شور علیگ)

یہ ثریّا یہ کہکشاں یہ نجوم — یہ مہ و سال کا سکوتِ دراز
چاک ہے جبرئیل کا دامن — یا دریچہ ہے نجم و ماہ کا باز
آسماں پر ہے گردِ انجم و ماہ — یا بھٹکتی ہے وقت کی آواز
ابنِ آدم کی روح کا ہے سکوں — یا خلا میں ہے ابر کی آواز
دوشِ فطرت پہ ہے جزیرۂ ماہ — یا سلگتا ہے خیمۂ شب باز
بامِ گردوں پہ چاند کی ہے کمند — یا مرے فکرِ شعر کا انداز
انجم و کہکشاں کے دامن پر — ہے شبِ غم نگاہ سجدہ طراز
عکس مہتاب میں ہو یوں جیسے — پڑھ رہا ہو امامِ شہر نماز
کس کو معلوم بحر و بر کا سکوت — کتنے طوفانوں کا ہے محرمِ راز
لوٹ کر آ رہے ہیں پھر لمحات — خامشی چھیڑتی ہے وقت کا ساز
چاند کے نقرہ پوش سائے میں — کوئی راہی ہے یوں نوا پرداز
جیسے رستے میں لے کے میرا نام — دے صدا دور سے کوئی دم ساز
آج اے دوست میرے اشکوں میں — کاش ڈھل جائے تیرِ غم کا گداز
میرا نالہ بھی تیری رسوائی — میرا نغمہ بھی درد کا غماز
دل دھڑکتا ہے رات یوں جیسے — آئینہ توڑتا ہو آئینہ ساز

کس نداند کجاست ایں مطلب
سخت نزدیک می رسد آواز

(شاکر کلکتوی)

حیا سے آنکھ سرِ بزم وہ اُٹھا نہ سکا
نظر کا تیر نظر میں رہا چلا نہ سکا

یہ بات عشق میں جایز نہ تھی مگر شاکر
جفائے دوست کا شکوہ زباں پہ لا نہ سکا

محبت میں یہ شرطِ رازداری بھی مصیبت ہے
میں جسکو چاہتا ہوں لے نہیں سکتا ہوں نام اسکا

میں نے یہ دیکھا جہانِ بیخودی عشق میں
جس کو جتنا ہوش تھا اتنا ہی وہ بے ہوش تھا

مرتے دم اک بیخودی شاکر پہ طاری تھی مگر
نام تیرا لے رہا تھا اس کو اتنا ہوش تھا

بیگانہ وار ہی وہ کریں مجھ پہ اک نگاہ
یہ تو نہیں ہے شیوۂ بیگانگی سے دور

جس کو چاہو قتل کرو تم،
کون کہے گا تم کو قاتل

محبت میں یارب یہ کیا ماجرا ہے
کبھی بدگماں وہ کبھی بدگماں ہم

آپ کی محفل کو ہم خلوت سمجھتے ہیں بجا
آپ ہوتے ہیں جہاں کوئی وہاں ہوتا نہیں

میں دل کے حال سے آگاہ ان کو کردوں گا
جو ہو گئی کبھی جرأت نظر ملانے کی

زمانے کا ہے تقاضا کچھ اور دل کا کچھ
میں اپنے دل کی سنوں یا سنوں زمانے کی

دیکھنا اُس شوخ نے پھیری ہے کب مجھ سے نظر
جبکہ ہے دشوار ترکِ مدعا میرے لئے

ہو اسے اندیشۂ سود و زیاں تو کس طرح
دل کو اپنے کاروبارِ شوق سے فرصت بھی ہے؟

(شفقت کاظمی)

اُٹھ کر تیرے در سے جانے والے
لوٹ آئیں گے پھر کسی بہانے

بھولا نہیں روٹھنا کسی کا
ہر چند گزر گئے زمانے

راہوں کا غبار ہو گئے ہیں
جن کو نہ ملے ترے ٹھکانے

رہ کر تیرے قرب میں جو دیکھے
وہ خواب تھے کس قدر سہانے

چونکے ہیں کب اہلِ بزم شفقت
جب ختم پر آ گئے فسانے

مطبوعات موصولہ

الجامع المسند امام احمد بن حنبل

حدیث کی کتابوں میں مسند احمد بن حنبل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ ۱۴۰ھ میں بمقام بغداد پیدا ہوئے، یہیں تعلیم پائی اور یہیں سے شام و عراق، حجاز و یمن کا سفر کرکے انھوں نے مطالعۂ احادیث کیا، جب سیاحت سے واپس آئے تو فقہ و اصول فقہ میں امام شافعی کی شاگردی اختیار کی اور عقاید معتزلہ تسلیم نہ کرنے پر عہد عباسیین میں قید و بند کے مصائب بھی جھیلے۔

ان کی تصانیف میں مسند کو بڑا مرتبہ حاصل ہے، کیونکہ یہ کتاب مع زواید کے تقریباً ۳۰ ہزار احادیث پر مشتمل ہے جنھیں انکے بیٹے عبداللہ نے مرتب کیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ کتب احادیث میں یہ کتاب دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہے اور ہر زمانہ میں اس کی قدر کی گئی ہے۔ چونکہ اس کی ترتیب موضوع کے لحاظ سے نہیں کی گئی تھی، اس لئے اس سے فایدہ اٹھانا بہت مشکل تھا اور ضرورت تھی کہ اس کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ ہر موضوع کی احادیث ایک ہی جگہ مل جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام آسان نہ تھا، لیکن اب دارالمصنفین ربوہ جو احمدی جماعت کا مشہور علمی و تحقیقی ادارہ ہے، اس خدمت کو انجام دے رہا ہے اور اس کا پہلا حصہ جو ۲۷۰۰ احادیث پر مشتمل ہے، بہ پابندی موضوع بڑے اہتمام کے ساتھ ٹائپ حروف میں نہایت نفیس کاغذ پر مجلد شایع کیا گیا ہے۔

احمدی جماعت نے جناب میرزا غلام احمد کے وقت سے لیکر اس وقت تک جتنی دینی خدمت انجام دی ہے اس کی اہمیت کا اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب تحریک احمدیت کے سارے لٹریچر کو سامنے رکھا جائے، لیکن بہت کم ہیں جنھوں نے تحقیق حق کے لئے اس محنت شاقہ کو گوارا کیا ہو، اور (بلا واسطہ دیگراں) احمدیت کی صحیح روح سمجھنے کی خود کوشش کی ہو۔

بہرحال کوئی ان کی خدمت کا اعتراف کرے یا نہ کرے وہ اپنے کام میں خلوص و صداقت کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔

"وان اللہ لا یضیع اجر المحسنین"

قابل مبارکباد ہے یہ ادارہ اور اس سے زیادہ قابل تحسین ہے جناب مرزا البشیر الدین محمود احمد صاحب (موجودہ امام احمدیت) کی ذات گرامی جن کی عالمانہ و محققانہ سرکردگی میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے، امید ہے کہ اس کے باقی حصے بھی جلد شایع ہو جائیں گے۔

افسوس ہے کہ اس میں ٹائپ کی متعدد غلطیاں پائی جاتی ہیں جو نہ ہونا چاہئے تھیں۔

ہدایت المجتہد

اردو ترجمہ ہے علامہ ابن رشد کی مشہور لیکن نایاب کتاب "ہدایت المقتصد" کے ایک حصہ کا جسے ادارۃ المصنفین ربوہ نے حال ہی میں شایع کیا ہے۔

علامہ ابن رشد ہسپانیۂ عرب کے سب سے بڑے فیلسوف و طبیب تھے اور جید فقیہ و محدث بھی، جب یہ قرطبہ کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے تو انھوں نے فقہی مسایل میں غیر معمولی مجتہدانہ فراست سے کام لیا اور کسی خاص فقیہی امام کے اتباع کو ضروری قرار نہیں دیا۔

ہرچند ابن رشد، مالکی مسلک سے متاثر تھے، لیکن انھوں نے کسی کی تقلید و پیروی نہیں کی اور خود قیاس و رائے سے کام لے کر مسایل فقہیہ گفتگو کی۔ انھوں نے فقہ و اصول فقہ پر متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے ایک وہ ہے جس کے ایک حصہ کا ترجمہ

ادارۃ المصنفین ربوہ نے اس وقت شایع کیا ہے۔ یہ حصہ نکاح، خلع، طلاق اور حقوق زوجیت وغیرہ کے احکام پر مشتمل ہے ترجمہ نہایت سلیس وہ شگفتہ ہے اور متعدد مفید حواشی سے اسے مفید بنا دیا گیا ہے۔

دیوان ملا غنیمت

غنیمت کنجاہ (پنجاب) کا مشہور فارسی شاعر تھا۔ اس کا نام محمد اکرم تھا اور اس کے آباو اجداد مغلیہ دور کے ابتدائی عہد میں شام سے ہجرت کر کے کنجاہ آ گئے تھے۔ اس کے والد نذر محمد کنجاہ کے مفتی تھے اور یہ خود عہد عالمگیر میں نواب محمد مکرم خاں گورنر لاہور کا ندیم و مصاحب تھا۔

یہ زمانہ وہ تھا جب نظیری، صائب، کلیم ہمدانی، ناصر علی سرہندی اور جلال اسیر کی شاعری لوگوں کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ اور غنیمت بھی، ان سب سے متاثر تھا، لیکن غزل گوئی میں اس نے زیادہ صائب کا اتباع کیا اور سب کچھ اسی ایک صاحب زبان کے انداز سے کہا۔

اس کا دیوان کمیاب تھا، لیکن پنجابی اکادمی لاہور نے اسے ڈھونڈھ نکالا اور اس کی ترتیب کی خدمت پروفیسر غلام ربانی عزیز کے سپرد کی جو فارسی شاعری کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔

انھوں نے مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر بڑی خوبی سے فرائض ترتیب انجام دئے اور اکادمی نے نہایت اہتمام سے ٹائپ کے حروف میں اسے مجلد شایع کیا۔

فاضل مرتب نے ابتدا میں مختصراً غنیمت کے رنگ شاعری پر بھی گفتگو کی ہے اور اس کا مرتبۂ شاعری متعین کرنے میں اعتدال سے نہ ہٹنے کی کوشش کی ہے۔

غنیمت نظراً مثنوی نگار شاعر تھا اور اسی لئے اس کی مثنوی نیرنگ عشق تو لوگوں کو یاد رہ گئی اور غزل گوئی کو بھول گئے۔ ضرورت تھی کہ پہلے نیرنگ عشق ہی کو شایع کیا جاتا کیونکہ اس کی شاعری کا صحیح عروج بھی اسی میں نظر آتا ہے۔

اس کتاب کا حجم ۳۱۶ صفحات ہے اور قیمت دس روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- پنجابی ادبی اکادمی - ۱۲ - جی - ماڈل ٹاؤن لاہور

امام ابن تیمیہ

تالیف ہے پروفیسر محمد یوسف کوکن عمری کی جو جامعۂ مدراس میں عربی و فارسی و اردو کے ریڈر ہیں۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کی تالیف میں جس غیر معمولی کاوش و تحقیق سے کام لیا ہے اس کا اندازہ آسان نہیں کیونکہ ابن تیمیہ ان چند غیر معمولی ہستیوں میں سے تھے جن کے علم و فضل، جن کی جامعیت اور ہمہ گیر فکر و فراست کا احاطہ دشوار ہے۔ ان کی علمی زندگی ایک مستقل ہنگامہ تھی جس نے دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی انھوں نے مذہبی مسایل میں خارجی، رافضی، قدری، معتزلہ اور اشعری تمام جماعتوں سے مناظرہ کیا اور اکثر فقہا سے جدا اپنی راہ الگ قایم کی۔

یہ ساتویں صدی ہجری کے اُن ہنگامہ خیز انسانوں میں سے تھے، جو اپنے بعد اپنی دہانت کی ایک مستقل یادگار چھوڑ گئے اور اوراق تاریخ پر مہر دوام ثبت کر گئے۔

ظاہر ہے کہ ایسے غیر معمولی انسان کے حالات زندگی لکھنے کے لئے بھی غیر معمولی تحقیق و جستجو درکار تھی اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پروفیسر محمد یوسف نے اس فرض کو جس خوبی سے ادا کیا ہے وہ ستایش سے مستغنی ہے۔

اس بڑے سائز کی ۲۷۶ صفحات کی کتاب میں ابن تیمیہ کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو نظر انداز کر دیا گیا ہو اور کوئی قابل ذکر واقعہ ایسا نہیں جو اس کتاب میں درج نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ فاضل مصنف نے یہ کتاب لکھ کر بڑی زبردست علمی و تاریخی خدمت انجام دی ہے، جس کی ہمیں پوری قدر کرنا چاہیئے۔

کتاب مجلد شایع کی گئی ہے اور خود مصنف سے مل سکتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

"نگار" کا آئندہ سالنامہ

جنوری سنہ ۶۰ء کے پہلے ہفتہ میں شایع ہو جائے گا

یہ سالنامہ کیا اور کیسا ہوگا اس کا صحیح اندازہ آپ کو اس کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ اجمالاً یوں سمجھ لیجئے کہ یہ سالنامہ انشاء عالیہ کا ایسا بے نظیر نمونہ ہوگا جس کی مثال آپ کو ادبِ اردو میں کوئی دوسری مل ہی نہیں سکتی اور جس کی ہر سطر ادبی جواہر پاروں کی ایک لڑی ہوگی۔

چونکہ یہ سالنا ایک حیثیت سے اڈیٹر نگار کی داستانِ حیات بھی ہوگا اس لئے ان کی تصاویر بھی مختلف زمانوں کی اس میں شایع کی جائیں گی۔

نیجر نگار لکھنؤ

"نگار" کے ایجنٹوں سے خطاب

کاغذ کی گرانی و کمیابی کی وجہ سے سالنامہ "نگار" سنہ ۶۰ء اتنی تعداد میں شایع نہ ہوگا کہ بعد میں بھی اس کی فراہمی ہو سکے۔ اس لئے

ایجنٹ صاحبان

سے درخواست ہے کہ وہ جلد از جلد مطلع فرمادیں کہ انھیں زیادہ سے زیادہ کتنی کاپیاں درکار ہوں گی۔

قیمت فی کاپی تین روپے اور کمیشن وہی جو ہمیشہ دیا جاتا ہے

نیجر نگار لکھنؤ